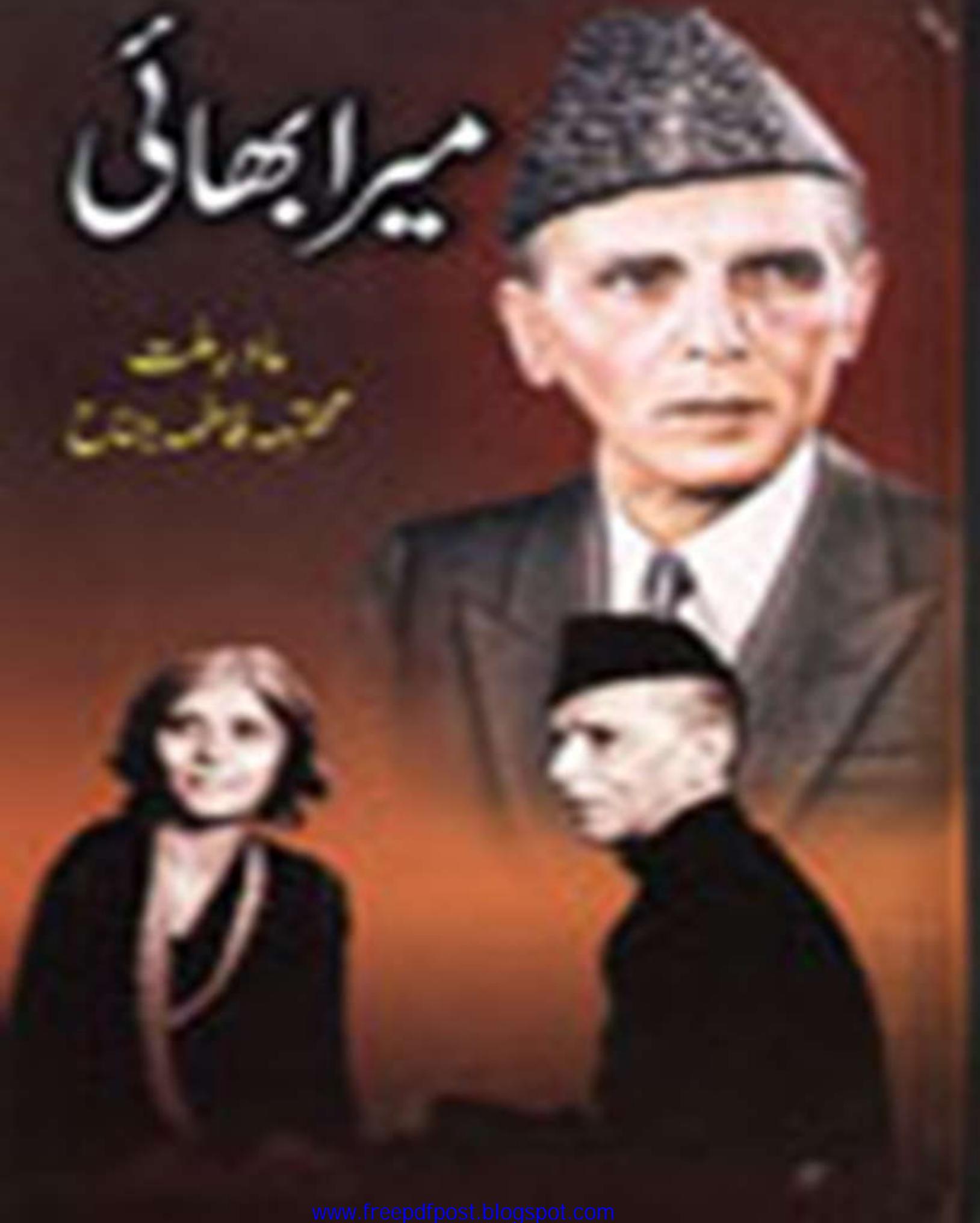


# سیر ایجاد انگل

باقاعدہ



میرا بھائی

فاطمہ جناح

**www.freepdfpost.blogspot.com**

## کاٹھیاواڑ سے کراچی تک

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں ب्रطانوی راج کا سورج انتہائی تیزی سے طلوع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے زندگی شروع کرنے والے ب्रطانوی تاجروں کیل تک ہندوستانی حکمرانوں سے مراءات، دوستی اور ہمدردانہ سلوک کی بھیک مانگا کرتے تھے۔ برصغیر ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی باغ ڈوران کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ اب یہ رویہ بدل چکا تھا اور وہ ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کر چکے تھے جو ب्रطانوی تاج شاہی میں ایک جگہ گاتے ہوئے ہیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلکہ حالات میں بظاہر خاموشی تھی۔ مگر یہ خاموشی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ فرنگی حکمرانوں کو یقین تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے رہنے والوں کو مہذب بنانے کے لئے جو کوششیں کی تھیں، اس سے ناراض ہندوستانیوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا اور تاج ب्रطانیہ کی عوام دوست پالیسی نے مقامی لوگوں کے دلوں سے انگریزوں سے نفرت اور سرکشی کے جذبات ختم کر دیے

تھے۔ انگریز حکمران ہندوستانیوں کے لارن میں الدرہی اور کوئے والے سے یکسرے خبر تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی انگریزوں کے خلاف ایک سخت عمل تھی۔ یہ بغاوت جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ یہ واقعہ انگریز حکمرانوں کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی طویل کتاب کے پہلے باب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس جنگ آزادی میں کئی لوگوں نے اپنی جانوں کا نذر انہ پیش کیا۔ ہندوستان کو آزاد کرنے کیلئے اس جنگ میں جانیں قربان کرنے والے سب لوگوں کو شہداء کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ نے ہماری قوم کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کئے اور پورا ہندوستان متاثر ہوا، اس کے باوجود ہندوستان میں کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں اس کشیدہ صورتحال میں بھی زندگی پر امن اور پر سکون رہی اور وہ ار د گرد ہونے والی ٹکنیں صورتحال سے بے نیاز رہے۔ کاٹھیاواڑ کی شاہی ریاست گونڈل ایک ایسا ہی علاقہ تھا جو مسی پر یزید یہ پی کے ماتحت تھا۔ تاج برطانیہ سے وفاداری کے طفیل ٹھاکر صاحب آف گونڈل کی حکمرانی پورے آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اپنی ریاست کو برطانیہ کے خلاف سرگرمیوں سے علیحدہ رکھنا ان کے اپنے مقاد میں تھا۔ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں ریاستی حکمرانی سخراوم نہ کر دیا جائے۔ ٹھاکر صاحب کی حکومت میں گونڈل ریاست کے لوگ اپنی زندگی کے معمولات میں مشغول تھے۔ وہ اس سیاسی جدوجہد سے بالکل متاثر نہ ہوئے، جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ریاست گونڈل کی میشیت کا انحصار زراعت پر تھا۔ نمایاں فضلوں میں کپاس، گندم، جوار اور باجرہ شامل تھیں۔ زرعی پیداوار میں جس چیز نے گونڈل کو خاص شہرت عطا کی تھی۔ وہ یہاں کی مرج تھی حتیٰ کہ آج بھی گونڈل کی مرچیں مشہور ہیں۔ ہمارے گھر میں میرے شعور کے

ابتدائی دنوں سے تمام کھانوں میں ہیشہ مرچوں کا فوب چڑکا دیا جاتا تھا۔ ہم میں سے جس کسی کو کھانے کا ذائقہ اپنے مزاج کے مطابق محسوس نہ ہوتا تو وہ ایک پلیٹ میں سے اپنے کھانے میں مزید مرچیں ڈال لیتا تھا۔ مرچوں سے بھری ہوئی پلیٹ ہمیشہ کھانے کی میز پر پڑی رہتی تھی۔

دارالحکومت ہونے کی وجہ سے گونڈل ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر ریاست کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی جو سادہ اور مطمئن زندگی گذار رہی تھی۔ ان لوگوں کی دنیا چھوٹی اور مختصری تھی۔ جس کی سرحدیں اس ریاست کی جغرافیائی حدود کے اندر رہی سمجھی ہوئی تھیں۔

ریاست کے دوسرے بہت سے دیہات کی طرح پانیلی بھی ایک ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

1857ء کے قریب جب جنگ آزادی کے ذریعے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف منظم سیاسی اپوزیشن کے شیعج بوئے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں پانیلی کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس گاؤں میں میرے دادا پونجھا رہتے تھے۔ ان کے آبا اور اجداد یہیں پیدا اور فوت ہوئے تھے۔ میرے دادا پانیلی کے ان چند لوگوں میں سے تھے جوز راعت پیشہ نہیں تھے۔ ان کی کچھ دستی کھڈیاں تھیں جن وہ خود کار گیروں کے بھراہ طویل اور تھکا دینے والے اوقات میں کام کیا کرتے تھے۔ اس مشقت کے نتیجے میں وہاں تھا کہا بنا ہوا خام کپڑا تیار کیا کرتے تھے جس کی فروخت سے انہیں اتنی آمدی ہو جاتی تھی کہ ان کے خاندان کا شمار اس چھوٹے سے گاؤں کے خوشحال گھر انوں میں کیا جاتا تھا۔

ان کے تین بیٹے تھے۔ والجی، ناٹھوا اور جناج۔ موخر الذکر ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام مان بائی تھا۔ جناج اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ فعال اور ارادے کے پکے تھے۔ وہ 1857ء کے تاریخی سال کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

جس کے دوران آزادی کی پہلی بدوہانی بروپا ہوئی۔ ان کے نوجوان اور بلند نظرہ ہن کو پانیلی نہ صرف ایک سرت رو اور خوابیدہ گاؤں معلوم ہوتا تھا، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایسی جگہ تھی جہاں زندگی مختص ایک چھوٹے سے بازار اور گاؤں کے کنویں پر ہونے والی گپ شپ کے گرد گھومتی تھی۔ انہوں نے ساتھا کہ گونڈل ایک بڑا شہر ہے جہاں زندگی زیادہ فعال ہے اور کار و بار بھی وسیع ہے۔ پانیلی میں رہ کر وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر خانہ انی کھڈیوں پر کام کرنے میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ یہ بہت چھوٹا سا کار و بار تھا۔ ان کی نظریں بڑے شہر پر گلی ہوئی تھیں، جہاں ان کی مہم جو یانہ طبع کو تسلیم مل سکتی تھی۔

ان کے والد نے کار و بار کے لئے انہیں نقدی تو کم ہی دی۔ مگر فیصلہ خوب کی کہ کسی بھی کار و بار میں سرمایہ لگانے سے پہلے تفصیل سے جائزہ لینا چاہئے کہ انہیں کس کار و بار میں جانا چاہئے۔ تجزیہ پسند اور محتاط ہن کے ساتھ تھوڑی پونچی کے مالک ہونے کے باعث میرے والد جلد بازی میں کوئی کار و بار شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم انہیں بعض ایسے کار و بار تلاش کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جن میں وہ جلدی خرید و فروخت کر سکتے تھے۔ کار و بار سے متعلق ان کی سوچ بوجھ اور سخت محنت کے باعث انہوں نے جلد ہی کافی منافع کمالیا۔ یوں ان کے اصل سرمائے میں اضافہ ہو گیا۔ چند ماہ بعد وہ جب گونڈل سے پانیلی واپس آئے تو ان کے والد یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک بڑے شہر میں ان کے بیٹے نے منافع بخش کار و بار شروع کیا ہے، زندگی کی پرانی اقدار پر یقین رکھنے کے باعث انہیں اندیشہ تھا کہ گونڈل جیسے بڑے شہر کی مختلف تر غیبات اور چکا چونداں کے نوجوان بیٹے کی توجہ اس منافع بخش کار و بار سے ہٹا سکتی ہیں، جسے اس نے نہایت مختصر عرصے کے دوران کامیابی سے منظم کیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے دادا کی عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے دونوں بڑے بیٹوں اور بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔

والدین کی واحد ذمہ داری اب یہ باقی رہا گئی تھی کہ سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ ہو جائے جس کا تعلق خود ان کے خوبیہ فرقے سے ہو یا کسی دوسرے اچھے خاندان سے۔

چنانچہ میرے والد کے لئے مناسب رشتہ کی تلاش شروع کر دی گئی۔ میرے دادا میرے والد کے پانیلی چھوڑ کر گوئڈل میں ایک نئی زندگی کا مستقل آغاز کرنے سے قبل ہی ان کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ رشتہ کی تلاش میں وہ پانیلی سے باہر نکل گئے اور وہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے واقع دھافہ نامی گاؤں میں جا پہنچے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی میٹھی بائی ان کے بیٹے کے لئے موزوں دہن ثابت ہوگی۔ رشتہ طے کرانے والوں کی معرفت لڑکی کے والدین سے رابطہ قائم کیا گیا۔ وہ لوگ رشتہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح میرے والد جناب اور میری والدہ میٹھی بائی کی شادی دھافہ میں دھافہ 1874ء کے لگ بھگ انجام پائی۔

میرے والد کا کاروبار پھیلتا گیا۔ اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کافی پراعتماد ہوتے گئے۔ تاہم ان کی رگوں میں سخت محنت کرنے اور مزید بڑا کاروبار کرنے کی خواہش بدستور موجود رہی، انہوں نے جس راستے کا بھی انتخاب کیا، اس پر آگے بڑھنے کیلئے سخت جانفشاری سے کام کیا۔ سستی، کاہیلی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہتے کو وہ اپنی راہ کی رکاوٹیں گرداتے تھے۔ فرض سے پچیں اور طویل اور سخت محنت کو وہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی قیمت تصور کرتے تھے جو بخوبی ادا کی جانی چاہئے۔ گوئڈل انہیں اپنی خواہشوں اور پھیلے ہوئے خوابوں کی تکمیل کے لئے بہت چھوٹی سی جگہ محسوس ہونے لگی۔ وہ بہبیتی جیسے بڑے شہر کے متعلق سن چکے تھے جو خوشحالی کا مسکن تھا اور جہاں کے کاروباری گھرانے بے تحاشا مال و دولت کے مالک تھے۔ وہ بہبیتی سے

نبتا چھوٹے ایک دوسرے شہر کراچی کے بارے میں بھی وہ افزاں خبریں سن چکے تھے جس نے گذشتہ چند برس کے دوران ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور وہ تجارتی مرکز کی حیثیت سے بھی تیزی سے پھل پھول رہا تھا۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ گونڈل کو چھوڑ کر اچھے مستقبل کی تلاش میں انہیں بمبئی جانا چاہئے یا کراچی۔ اگرچہ وسیع تر کاروباری موقع انہیں بمبئی جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ مگر تقدیریان کے بارے میں اپنا فیصلہ نہ چکی تھی اور یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس کے نتیجے میں میرے والدین کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے۔

میرے والد نے اس سے پہلے کراچی جتنا بڑا شہر نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک اس شہر کی شہرت کا باعث محض کھڈا ہی تھا۔ یہاں کشیاں روزانہ تازہ مچھلی پکڑ کر لاتی تھیں جنہیں دھوپ میں کھلی جگہوں پر خشک کر کے مچھلی گوداموں میں ذخیرہ کر لیا جاتا تھا۔ یہ گودام ساحل کے ساتھ ساتھ بے ترتیبی سے قائم کئے گئے تھے۔ تب کھارا دار محض چند لوگوں کے مجموعے کا نام تھا اور جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے یہاں بھیرہ عرب کا نمکین پانی سڑکوں اور گلی کوچوں تک میں آتا رہتا تھا۔ میٹھا در میں لیا ری اور ملیر در یا وہ کامیابی کا میٹھا پانی صرف گھٹنے کی گہرائی تک کنواں کھونے پر نکل آیا کرتا تھا۔ صدر کے علاقے میں برتاؤی فوجی دستے مقیم ہوا کرتے تھے اور ان کی کنٹونمنٹ اور بیرکس وہیں آباد تھیں۔ میرے والد نے دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان نیونہم روڈ کھارا در میں کرائے پر لے لیا۔ یہ علاقہ شہر کا کاروباری مرکز تھا۔ یہاں بہت کاروبار پکھرائے آباد تھے اور ان میں سے بعض گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے تھے۔

وہ عمارت جس میں ہمارا گھر تھا، چونے کے ساتھ پتھروں کی چنانی کر کے تعمیر کی گئی تھی اور اس کے فرش اور چھتیں لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھیں۔ ہمارا اپارٹمنٹ پہلی منزل پر واقع تھا۔ جس میں لکڑی اور لوہے سے بنی ہوئی ایک کشاورہ بالکوئی بھی تھی جو باہر کی جانب سڑک کے اوپر

چھجھے کا اضافہ نہ کر کے بنائی گئی تھی۔ یہ پاکونی دن کے وقت بیٹت کے لئے شہنڈی اور ہوا دار تھی اور رات کو اس میں ایک چار پائی بچھائی جا سکتی تھی۔ بالکونی اور دونوں کمروں کا رخ مغرب کی جانب تھا جو کراچی میں مکانوں کا بہترین رخ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس جانب سے سمندر کی شہنڈی اور تیز ہوا سارا سال آتی رہتی ہے۔

نوجوان مسٹر جناح کو شروع شروع میں کسی اچھے منافع بخش کاروبار کی تلاش میں کافی مشکل ہوئی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی کاروباروں میں قسمت آزمائی کی اور پھر بتدربنج اُن کی آمد نی میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کی قسمت ان دنوں عروج پر تھی۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے، ان کے دارے نیارے ہو جاتے۔ اس زمانے میں کراچی میں کچھ برطانوی فری میں تھیں جو کراچی اور دوسرے اندر ورنی علاقوں کی پیداوار یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں کو برآمد کرتی تھیں۔ یہ فری میں انگلینڈ سے روزمرہ استعمال کی چیزیں درآمد کرتی تھیں۔ گراہم زریڈ نگ کمپنی ایک ایسی ہی فرم تھی اور اس کا شمار کراچی میں درآمد برآمد کا کاروبار کرنے والے صفوں اول کے اداروں میں ہوتا تھا۔ میرے والد نے کسی سکول سے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر انہوں نے اپنی محنت اور فطری میلان طبع کے باعث روانی سے انگریزی میں بات کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں اسے اچھا خاصاً کمال سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ تب کراچی کے چند ایک تاجر ہی انگریزی میں بات چیت کرنے کے قابل تھے۔ شاید یہ ان کی انگریزی میں بات چیت کرنے کی قابلیت ہی تھی جس کے باعث وہ گراہم زریڈ کمپنی کے جزل میجر کے کافی قریب آگئے اور یہ تعلق ان کے کاروبار کی تیزی سے ترقی کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔

کئی برس بعد جب ہمارا گھر انہ کچھ عرصے کے لئے رتنا گیری میں مقیم تھا تو میرے والد مجھے اور میری دو بہنوں کو رات کے وقت انگریزی لکھنا پڑھنا سکھایا کرتے تھے۔ وہ ڈسپلن کی سختی

سے پابندی کرتے تھے اور ہمیں انگریزی پڑائے کے اس گنتے کے دوران ایسا رویہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ گویا ہم سکول میں اپنے کلاس روم میں ہوں، ہم بچوں کو اپنے والد بہت بڑے آدمی نظر آتے تھے۔ ایک ایسے بڑے آدمی جو نہایت اچھی انگریزی بول سکتے تھے۔ ہم ان پر رشک کیا کرتے تھے اور ہماری بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ہم بھی ان کی طرح عمدہ انگریزی میں بات کر سکتیں۔ کبھی کبھی جب ہم تینوں بہنیں مل پڑتیں اور شرارت کے موڑ میں ہوتیں تو اپنے والد کی انگریزی کی نقل اتنا کرتیں۔ ہم میں سے ایک کہتی: اش فش، اش فش ایس اور دوسری جواب دیتی: اش فش، اش فش، تو، ہم یہ کھیل نہایت سنجیدگی سے کھیلا کرتیں اور جھوٹ موت یوں ظاہر کرتیں گویا اگر ہم پہلے ہی انگریزی پر عبور حاصل نہیں کر چکیں تو اسے سیکھنے کے مرحلے تک ضرور پہنچ چکی ہیں۔ ان دونوں قندھار سے بہت سے افغان تاجر کاروبار کے لئے آیا کرتے تھے۔ میرے والد کے ان لوگوں کے ساتھ بھی وسیع کاروباری سودے ہوا کرتے تھے۔ کئی برس تک ان کے ساتھ گفتگو کرتے رہنے سے میرے والد نے فارسی بولنے میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ میں نے انہیں اکثر روانی سے فارسی زبان میں بات کرتے دیکھا۔ کاٹھیاواڑ سے تعلق رکھنے کے باعث ہمارے گھر میں گجراتی زبان بولی جاتی تھی مگر کراچی میں مقیم ہونے کے بعد ہمارے گھر انے کے افراد کچھی اور سندھی بھی روانی سے بولنے لگے۔

گراہم ٹریننگ کمپنی کے ساتھ کاروباری تعلقات استوار ہو جانے کے بعد میرے والد نے دوسری کاروباری دلچسپیوں کے علاوہ مچھلی کے جیلاش اور گوند کا کاروبار شروع کر لیا۔ ان کے کاروباری تعلقات کئی ملکوں تک پھیل چکے تھے۔ جن میں انگلینڈ اور ہائگ کا ہنگ کا ہنگ خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ چونکہ ان ملکوں کے کاروباری اداروں کے ساتھ انگریزی میں خط و کتابت کرتا پڑتی تھی۔ لہذا میرے والد نے انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

ان دنوں کھارا در کے بعض کا روپ اپنی **حیرت** کے علاوہ بنکاری بھی کرتے تھے۔ <http://libraryofurdubooks.blogspot.com/>

سندھ بلوچستان اور پنجاب جیسے ساحل سے دور علاقوں کی تمام تر تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی تھی اور بنکاری کی باقاعدہ اور موزوں سہولتوں کی عدم موجودگی میں رقوم کی منتقلی کا زیادہ تر کام کراچی کی انہی فرموں کے تعاون اور توسط سے انجام پاتا تھا۔ بہت سے گھرانے اپنی بچت کی رقوم بھی ان فرموں کے پاس جمع کروادیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل ہم لوگ بنکوں میں اپناروپیہ رکھ دیتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ان فرموں کے ہاں بنکاری کا مکمل اور جدید ترین نظام موجود نہیں تھا۔ مگر یہ تا جرانتہائی دیانت دار ہوتے تھے اور ان کا زبانی وعدہ بھی سب سے بڑی یقین دہانی ہوا کرتا تھا۔ میرے والد کی فرم جناح پونچا اینڈ کمپنی بھی اس قسم کا ایک ادارہ تھی۔ جس کا کاروبار کافی وسیع تھا اور منافع بخش خطوط پر چل رہا تھا۔ اس فرم پر کاروباری طبقے اور عام لوگوں کو مکمل اعتماد تھا۔

میری والدہ امید سے تھیں اور میرے والد اپنی نوجوان بیوی کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہے تھے، دونوں میاں بیوی اپنے پہلے بچے کی ولادت کے بارے میں خاصے پر جوش اور مسرور تھے۔ اس وقت کراچی میں میٹریٹی ہوم نام کی شاید ہی کوئی چیز تھی۔ بس چند ایک دائیاں تھیں۔ جن کی اپنے پیشے میں شہرت اچھی تھی۔ لہذا انہی کو چاروں طرف سے بلا وے آتے رہتے تھے۔ اور وہ خاصی مصروف رہا کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت سے قبل زچہ اور بچہ کی صحت کے لئے حفاظتی مداری اور علاج معالجہ وغیرہ سے کوئی آگاہ نہ تھا، بلکہ عین ولادت کے موقع پر دائی کو گھر بلا یا جاتا تھا۔ متمول علاقہ ہونے کی وجہ سے کھارا در میں ایک دائی رہتی تھی۔ جسے شہر کی بہترین دائی سمجھا جاتا تھا۔ اسے زچگی کے روزمرہ کے واقعات میں مسلسل خدمات سر انجام دینے کے باعث اس قسم کے امور کا کافی تجربہ تھا۔ چنانچہ والدہ نے اس عورت کی خدمات پہلے

سے حاصل کر لیں۔ اسی عورت کے ہاتھوں میری والد کے ہیں ان کے پہلے بچے کی ولادت عمل میں آئی۔ یہ لڑکا تھا۔ اس روز تاریخ 25 دسمبر 1876ء اور انوار کا دن تھا۔

بچہ کمزور اور دبلا پتلا سا تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے پتلے تھے۔ سر بڑا اور لمبورا سا تھا۔ والدین اس کی صحت کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ بچے کا وزن بھی معمول سے کئی پونڈ کم تھا۔ انہوں نے بچے کا ایک ڈاکٹر سے معاشرہ کرایا، جس نے بتایا کہ ظاہری کمزوری کے سوا بچے کی صحت یا اعضاء میں کوئی نقص نہیں ہے اور یہ کہ والدین کو اس کی صحت کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے، مگر ایک ڈاکٹر کی خالی خوبی یقین دہانی سے ایک شفیق ماں کے خدشات اور تشویش کیونکر ختم ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد بچے کا نام رکھنے کا سوال پیدا ہوا۔ اب تک کاٹھیاواڑ میں آباد ہمارے خاندان کے مردوں کے نام بڑی حد تک ہندوؤں کے ناموں سے ملتے جلتے تھے، مگر سنده ایک مسلم صوبہ تھا اور یہاں والدین کے پاس پڑوں میں آباد لوگوں کے بچوں کے نام مسلمانوں جیسے تھے۔ والدین کا اتفاق رائے اس پر ہوا کہ ان کے پہلے بیٹے کا نام محمد علی اچھا ہے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچے کا نام یہی رکھا۔

میری والدہ محمد علی سے انتہائی محبت کرتی تھیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے بعد ازاں چھوڑ کر بچوں کو بھی جنم دیا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک محمد علی سے سب سے زیادہ پیار کرتی رہیں۔ رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندہ علی ان کے دیگر بچے تھے، جن میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔

میرے والد کے کندھوں پر بڑھتے ہوئے کاروبار کی بھاری ذمہ داریاں تھیں، مگر میری والدہ کا مسلسل اصرار تھا کہ محمد علی کو آبائی گاؤں پانیلی سے دس میل کے فاصلے پر واقع گانود میں

اس درگاہ میں مدفون اس پیر کے عقیدت مندوں سے ان کی مجھ نما قوتوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ان (میٹھی پائی) کی والدہ کی پیش گوئی نے انہیں یقین دلادیا تھا کہ ایک عظیم مستقبل محمد علی کا منتظر ہے۔ اس لئے بھی وہ اسے حسن پیر کی درگاہ پر لے جانا چاہتی تھیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق وہاں محمد علی کے سر کے بارے اتارنے کی رسم منعقد کی جانی تھی۔ بچے کی والدہ اپنی منت پوری ہونے کے لئے مقدس پیر کی نواز شات طلب کرنا چاہتی تھی۔ پہلے پہل تو میرے والد نے یہ کہہ کر اس سے بچنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ماہ سے زائد عرصے تک کراچی سے باہر نہیں رہ سکتے۔ مگر آخر کار انہیں اپنی نوجوان یوں کے دلائل کے سامنے نرم ہونا پڑا۔ اور یوں اپنے چند ماہ کے بیٹے کے ساتھ ہمارے والدین نے کراچی سے ویراواں جانے والی ایک بادبائی کشتی میں اپنی نشانیں بک کر والیں، ویراواں نامی بند رگاہ کاٹھیاواڑ میں واقع ہے۔ اس سفر میں طوفان اور شدید سمندری بارش سے دوچار ہونے کے خدشات بھی موجود تھے، مگر انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔

کشتی خراب حالت میں تھی جو مسافروں کے بوجھ سے بری طرح لدی ہوئی تھی، طوفان میں پھنس گئی اور کھلی سمندر میں لکڑی کے تختے کی طرح ڈگمگانے لگی۔ کشتی میں موجود لوگ خوف و ہراس میں بنتا تھا۔ ایسے موقعوں پر گھبراہٹ بہت تیزی سے پھیلا کرتی ہے۔ میرے والد سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے کہ نہ جانے یہ طوفان کب تھی گا، میری والدہ بچپن سے گائے کشتی کے مسافروں کا سفر بخیر و عافیت ختم ہونے کی دعا میں کر رہی تھیں۔ جس میں ان کا لاڑلا بیٹا محمد علی بھی شامل تھا۔ طوفان کے بعد سمندر پر عجیب و غریب سکوت طاری ہو گیا اور کشتی بآسانی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ کئی روز بعد میری والدہ نے والد کو بتایا کہ پریشانی کے

ان لمحات کے دوران انہوں نے بتاں تھی کہ اگر وہ بحثاً لیت اپنی منزل پر پہنچ گئے تو وہ گانوں میں حسن پیر کے مزار پر مزید ایک روز قیام کریں گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اس کا شکر ادا کریں گی۔

کشتنی ویراواں بندرگاہ پر لٹکر انداز ہوئی اور بخیر و عافیت خشکی پر قدم رکھنے میں کامیاب ہو گئے وہاں سے گانوں تک چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے لئے انہوں نے ایک بیل گاڑی کرائے پر لے لی۔ بخیرہ عرب میں ایک طوفانی سفر اور بچکو لے کھاتی ہوئی بیل گاڑی میں سواری کے بعد یہ لوگ بالآخر اپنی منزل پر جا پہنچے۔ اور اب میرا چھوٹا بھائی محمد علی اپنی والدہ کی آنکھوں میں اور بے شمار رشتہ داروں کے ہجوم میں گھرا حسن پیر کی درگاہ پر سرمنڈا نے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ یوں میری والدہ کی منت پوری ہو گئی۔

حسن پیر کی زندگی کے حقائق داستانوں کے ساتھ یوں غلط ملط ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ حسن پیر اسماعیلی مبلغ کی خلیت سے ایران سے خشکی کے راستے بلوجستان سے ہوتے ہوئے اس علاقے میں آئے تھے۔ راستے میں انہوں نے کچھ عرصہ ملتان میں بھی قیام کیا تھا۔ ان کی صوفیانہ اور مثالی زندگی کے باعث بہت سے لوگ ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے تھے اور بہت سے غیر مسلموں نیان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ سیہز رگ بعد ازاں سندھ کی جانب روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا، پھر وہ بچھ میں آئکے، اور بالآخر پانیلی کے قریب ایک مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی اس علاقے میں آباد غیر مسلموں کو اسلام کی تبلیغ کرنے میں گذار دی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مافق افطرت قوتوں کے مالک تھے، ان کی ذات سے بہت سی حکایات

وہ استہمیں، اس قسم کی باتیں عموماً ایسی شفیعیات ہے وابستہ کروی جاتی ہیں جن کی زندگی کے اصل واقعات اور کارناٹے تاریخی شہادتوں سے محروم ہو اکرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حسن پیر ان مسلمان صوفیائے کرام کے نقش قدم پر گام زن تھے، جن کے دن قرآن کی تعلیم اور اسلام کا پیغام پھیلانے اور راتیں عافانہ مراقبوں میں گذراتی ہیں، ان کی عادت تھی کہ رات کو جلدی سو جایا کرتے تھے اور علی اصح دو بجے کے قریب بیدار ہو کر اپنے خیے کے باہر دریائے بدھار کے کنارے صبح کی نماز تک استغراق رہا کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ رب سے لوگائے بیٹھے تھے کہ پانی کی ایک بہت بڑی لہر دریا کا کنارا پھلانگ کر حفاظتی پشتے سے بھی آگے تک نکل گئی۔ دریا کے منہ زور پانی کے اچانک آنے والے ریلے کے بہاؤ پر سفر کرتی اس جگہ کے قریب کنارے سے آگئی، جسے گانودگاؤں کہا جاتا ہے، یہاں را باری ذات کے غیر مسلموں کی اکثریت آباد تھی۔ ان لوگوں کا آبائی پیشہ گاؤں میں پالنا تھا۔

علی اصح جب چند را باری دریائے بدھار کے کنارے پہنچنے تو انہوں نے حسن پیر کیلاش دیکھی جسے دریا کی لہریں ساحل پر چھوڑ گئی تھیں۔ انہوں نے ان بزرگ کو فوراً پہچان لیا، جن کی شہرت پانیلی گاؤں کی جغرافیائی حدود سے نکل کر آس پاس کے علاقوں تک پھیل چکی تھی، را باریوں کے بڑوں نے باہم صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان بزرگ کی لعش انہیں قدرت کی جانب سے تھے میں دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی شایانِ شان طریقے سے تدفین کریں گے اور ان کا مزار بھی تعمیر کرائیں گے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ حسن پیر کی درگاہ تعمیر کرنے سے ان کے گاؤں میں خوشحالی آجائے گی۔

اس طرح حسن پیر گانودگاؤں میں دفن ہوئے۔ برسوں گذر جانے کے باوجود گونڈل ریاست کے لوگوں کا حسن پیر کی درگاہ کی زیارت کرنے کے لئے جوش و خروش کم نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ ان بزرگ کی درگاہ پر آج بھی ان کا عرض ہر ماں باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے۔  
جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

حسن پیر کی درگاہ پر عقیقہ کی رسم سرانجام دینے کے بعد میرے والدین بالوں سے صاف سر  
والے نہیں منے بیٹے کو لے اپنے آبائی گاؤں پانیلی آگئے۔ یہ سفر بھی انہوں نے نیل گاڑی میں  
ٹکیا۔ میرے والد کے لڑکپن کے دوست اور رشتہ دار کراچی میں ان کی کامیابیوں کے بارے  
میں شاندار کہانیاں سن چکے تھے۔ اس کامیابی نے انہیں اس قدر اہمیت دلادی تھی کہ ان کے  
آبائی گاؤں کے باشندوں کی نظروں میں ان کیلئے بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے  
اپنے چہیتے بیٹے کی ولادت کی خوشی منانے کے لئے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں پورے  
گاؤں کورات کے کھانے پر بلا یا۔ اپنے بچپن کے دنوں میں، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا۔  
اس روز پانیلی کے کسی ایک گھر میں بھی چولہا نہیں جلا یا گیا تھا۔ لوگوں کے گھروں میں کھانے  
پکائیے برتن اور کھانا کھانے کی پلٹیں بدستور باور پچی خانوں کے طاقچوں میں پڑی رہیں۔ گویا یہ  
بھی اپنی اپنی جگہوں پر آرام کرتے ہوئے نہیں محمد علی کی پیدائش کی خوشی منارہی ہوں، جو پانیلی  
کے ایک دیہاتی کا بیٹا تھا۔

پانیلی اور گونڈل میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد میرے والدین اپنے نہیں بیٹے کے  
ساتھ کراچی واپس آگئے۔ جس کا نتھا ساڑہ، میں ابھی اس بات کا اور اک نہیں کر سکتا تھا کہ گاؤں دا اور  
پانیلی میں اس کی آمد اس قدر جوش و خروش اور پر مسرت تقریبیوں کا باعث بنی رہی ہے، کراچی  
واپس پہنچ کر میرے والد تو اپنی کار و باری ذمہ داریاں نبھانے میں مصروف ہو گئے، جب کہ  
والدہ نے اپنی تمام تر توجہ اور وقت اپنے نو مولود بیٹے کو دینا شرع کر دیا۔

کسی موقع پر پیسوں کی شدید ضرورت کے باوجود، خاص طور پر جب والدہ کی یہ خواہش

ہوتی۔ میرے والد بود و باش اور روپے پیپر کے معاملے میں مخاطب شہر میں پاؤں جمانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا، اسے چھوٹی چھوٹی رقومے معاملے میں مخاطب ہونا ہی چاہئے تھا۔ یہ گھر انہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شان و شوکت کی کمی کو ایک خوش و خرم زندگی کے تپاک سے پورا کیا جاتا۔ اگرچہ میرے والد کا کار و بار کافی کھیل گیا۔ تب بھی بے مصرف کاموں پر روپیہ خرچ نہ کرنے کی عادت برقرار رہی۔ دولت آنی جانی چیز ہے، یہ آج آپ پر مہریاں ہو سکتی ہے مگر کون جانتا ہے کہ کل اس کا موڈ کیا ہو گا۔ میرے والد نے اسی اصول کے تحت گھر کا بجٹ چلا یا۔ جب ہم لوگ بڑے ہوئے تو اس بات کا ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا اثر موجود تھا۔ قائد اعظم کی زندگی کا یہ انداز ایسا تھا جو ہمیشہ برقرار رہا۔

محمد علی اب تقریباً چھ سال کے ہو چکے تھے۔ اور میرے والدین نے انہیں گھر پر ہی گھر اتی پڑھانے کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کر لیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور سب سے قریبی سکول بھی ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ اتنا تھا کہ والدین کے خیال میں چھ سال کا بچہ اسے پیدل طے کرنے کے قابل نہیں تھا۔ محمد علی کو پڑھنے کے لئے جو سبق دیا جاتا، وہ اس سے لا پرواہ سے رہتے۔ وہ قطعی طور پر جمع تفریق کی حسابی دنیا میں داخل ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح استاد کے ساتھ ان کا وقت ایک ناگوار جبوري کی حالت میں گزرتا۔ اس کے برعکس جب وہ پڑوئی لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مشغول ہوتے تو زیادہ خوش و خرم رہا کرتے اور زیادہ بے تکلفی سے کام لیتے۔ ان لڑکوں میں انہیں کھیلوں میں مہارت رکھنے والے بچے کی شہرت حاصل تھی۔ ان کے ساتھ بچے انہیں اپنے بچگانہ ذہنوں میں اپنا لیڈر تصور کرتے اور محمد علی نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بہتر ہیں۔ جب وہ نو سال کے ہوئے تو انہیں پر انگری سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں امتحان کے

انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ سکول میں دوسرے لڑکے نے ان سے زیادہ نمبر حاصل کر کے ان سے آگے نکل گئے تھے۔ کھیلوں میں وہ دوسرے لڑکوں کو شکست دیا کرتے تھے، وہ خود کو ہمیشہ دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے، مگر انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی کلاس میں اول پوزیشن کے مالک نہیں تھے، سکول جانے کے بعد انہیں اپنے کھیل کے اوقات سے کئی گھنٹے پڑھائی کے لئے نکالنے پڑے تھے اور سکول میں اتنا وقت رہ کر بھی انہیں بہترین طالب علم کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا دل کتابوں اور سکول سے اچاٹ ہو گیا۔ جس نے میرے والد کو پریشان کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو مناسب تعلیم دلانا چاہتے تھے تاکہ وہ میڑک کرنے کے بعد ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو سکے۔ میری والدہ جنہیں محمد علی کی خوش بختی پر اندھا اعتماد تھا۔ اکثر کہا کرتی تھیں: میرا محمد علی بہت بڑا آدمی بنے گا، وہ بہت ذہین اور ہوشیار ہو گا۔ وہ دوسرے لڑکوں سے بہت بہتر ثابت ہو گا مگر اب انہیں اپنے خواب ٹوٹ کر زمین پر بکھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ماں نے انہیں پیار سے سمجھایا کہ وہ باقاعدگی سے سکول جایا کریں اور اپنی تعلیم کی جانب سنجیدگی سے توجہ دیں کیونکہ صرف اس طرح وہ زندگی میں آگے بڑھ سکتے ہیں اور ایک بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ جو دوسروں سے بلند و برتر اور ممتاز ہو گا۔ بچے کی ہٹ دھرمی پر شدید رنجیدہ ہونے کے باوجود والد نے ان کے ساتھ نرمی سے کام لیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی کتابوں پر پوری طرح توجہ دیتے رہیں۔ نخجے محمد علی نے کہا: ”ابا جان مجھے سکول جانا اچھا نہیں لگتا۔“

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”ابا جان میں آپ کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر کاروبار سکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں آپ کے دفتر میں بیٹھ کر سکول کی نسبت زیادہ بہتر کام کروں گا۔“

میرے والد ہیں انسان تھے۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے بیٹھ کو تر غیب دینے کی کوشش کی۔ محمد علی میرے دفتر کا ڈپلن بہت سخت ہے۔ تمہیں میرے ساتھ صحیح آٹھ بجے دفتر جانا پڑے گا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ہم دو بجے سے چار بجے تک گھر واپس آئیں گے۔ اور اس کے بعد ہمیں دوبارہ چار سے نو بجے رات تک دفتر میں رہنا ہو گا؟

”میں ایسا ہی کروں گا، ابا جان۔“

”مگر تمہیں کھیلنے کے لئے بالکل وقت نہیں ملے گا۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“

اور یوں نہیں منے محمد علی والد کے دفتر اور اپنے کمرہ جماعت کے درمیانی فاصلوں کو توڑتے ہوئے میرے والد کے ساتھ شریک کار ہو گئے۔ لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دفتر میں کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہر کام کا تعلق لکھنے پڑھنے سے تھا۔ وصول اور ادا کی جانے والی رقم رجسٹروں اور کھاتوں میں درج کی جاتی تھیں اور انہیں نہ پڑھنا لکھنا آتا تھا اور نہ ہی حساب کتاب۔ دفتر میں وہ صرف چھوٹے موٹے کام کر سکتے تھے جنہیں وہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مال کی خرید و فروخت اور دوسرے اہم امور کے متعلق فیصلے ہمارے والد اپنے کار و باری مشیروں یا ورکروں کے مشورے سے خود کرتے تھے۔ محمد علی سے نہ تو کوئی مشورہ کرتا تھا اور نہ ہی ان کی رضامندی یا منظوری حاصل کرتا تھا۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ دفتر میں بیٹھنے سے وہ اپنے پسندیدہ کھیلوں سے یکسر الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔

چنانچہ صرف دو ماہ کے اندر ہی وہ دفتر کے کام سے اکتا گئے اور ایک روز انہوں نے میرے

”پھر تم کیا کرو گے محمد علی؟“

”میں واپس سکول جانا چاہتا ہوں۔“

میرے والد بہت خوش ہوئے مگر انہوں نے اپنی خوشی کو چھپائے رکھنا ہی بہتر سمجھا۔ انہوں نے کہا: ”دیکھو یہاں زندگی کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں۔“

”ابا جان، وہ کون کون سے ہیں؟“ محمد علی نے پوچھا۔

”ایک یہ کہ آپ اپنے بزرگوں کی دانش اور تجربے پر بھروسہ کریں۔ ان کی نصیحت قبول کریں اور ان کے مشورے کے عین مطابق عمل کریں۔“

”اور دوسرا راستہ کون سا ہے ابا جان؟“

”دوسری طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اپنے راستے پر چلیں، چاہے غلطیاں کریں مگر ان سے سبق یہ کھیں اور زندگی کی شدید اور تکلیف دھنکو کروں اور مشکلات سے زندگی کو یہ کھیں اور سمجھیں۔“ کم عمر محمد علی اپنے والد کی باتوں کو پوری توجہ سے سنتے رہے۔ یہ واقعہ قائد کے اس وصف کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ زندگی بھر خود اپنے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے رہے۔

سکول واپس لوٹ آنے پر وہ ایک بالکل بد لے ہوئے بچے تھے۔ اب وہ لا تعلق، غیر متوجہ اور اپنے ہم جماعت سے کسی طرح بھی پیچھے نہ رہتے تھے۔ وہ اپنے ضائع شدہ وقت کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہر عمر بلکہ ان سے چھوٹے لڑکے بھی پڑھنے لکھنے میں اب تک ان سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے اس باق انتہائی محنت سے یاد کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے تھے۔ وہ آگے بڑھنے کا اعزام کر چکے تھے۔ میرے والد محمد علی کے سنجیدگی سے پڑھائی پر توجہ دینے سے بہت خوش تھے، ایک روز سر راہ ان کی ملاقات اپنے بیٹے کے استاد سے

ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ان کا بیٹا پڑھائیں کیا رہا ہے۔ <http://libraryofurdubooks.blogspot.com> استاد نے کہا: ”وہ بہتر ہوتا جا رہا ہے مگر میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا بیٹا حساب میں بہت کمزور ہے۔“

اس سے میرے والد کو بے حد مایوس ہوئی۔ ان کا پہلے ہی خیال تھا کہ ان کے بیٹے کی والدہ کے یقین کے عین برعکس ان کا بیٹا غیر معمولی ذہانت یا اوصاف کا مالک نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کا بیٹا جوان ہو کر ان کے لئے قبل از وقت سہارے کا باعث بن سکے گے۔ وہ اپنے اساتذہ کے سامنے پہلے ہی خود کو ایک ہونہار طالب علم ثابت نہیں کر سکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سخت احتیان کے بل پر وہ امتحان میں کامیابی تو حاصل کر لے گا، لیکن اس کیب عد دفتر کلکوں کے گمنام عہدوں میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ میرے والد چاہتے تھے کہ محمد علی حساب میں طاق ہو جائے کیونکہ کار و بار میں حساب کتاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب ان کا بیٹا ان سے کار و بار سنبھالے تو ان کی فرم جناح پونچا اینڈ کمپنی ایک فعال کار و باری ادارے کی طرح آگئے ہی آگئے بڑھتی رہے۔ میرے والد سوچنے لگے: ”حساب میں کمزور۔ حیرت ہے یہ لڑکا آخر کیا بنے گا۔“

لیکن محمد علی پر میری والدہ کا اعتماد غیر مترکز تھا۔ وہ کہتیں: ”تم دیکھنا تو سہی میرا محمد علی، بہت اچھے اچھے کام کرے گا اور بہت سے لوگ اس سے حسد کرنے لگیں گے۔“

میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اپنی بیوی کے وجدان پر چلنے کے بجائے انہیں وہ کام کرنا چاہئے جو بظاہر میرے بھائی کے بہترین مفاد میں ہے، انہوں نے محمد علی کو اپنے گھر سے دور کی سکول بھجوانے کا فیصلہ کیا، کیونکہ کھارادر کے پرائمری سکول میں ان کے ہم جماعتیوں کے ساتھ میل جوں کے ان پر منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ یہ لڑکے محمد علی کو ہمیشہ کتابیں چھوڑ کر گولیاں، لٹو، گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ والد نے فیصلہ کیا کہ محمد

علی کو نیو ہم روڈ پر اپنے گھر سے تقریباً یک میل کے فاصلے پر قع سندھ میں مسلمانوں کے واحد سکول سندھ مدرسہ الاسلام میں داخل کروادیا جائے۔ اس سکول کے بانی خان بہادر حسن علی آفندی تھے۔

محمد علی کو سندھ مدرسہ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا، تو ان کی عمر تقریباً دس برس تھی۔ سکول کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ سکول میں داخل کئے جانے والے لڑکوں میں ان کا نمبر 114 تھا۔ سکول کی تبدیلی سے محمد علی کے اپنی تعلیم کی جانب رجحان میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ بدستور سکول میں تعلیم کے میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے بجائے کھیل کے گروئنڈ میں کامیابیان حاصل کرتے رہے۔

تقریباً انہی دنوں اتفاق سے میرے والد کی اکلوتی بہن بمبی سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ مان بائی کی شادی بمبی میں ہوئی تھی اور وہ وہیں اپنے خاوند کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ ہم انہیں مان بائی پونی (پھوپھی) کہا کرتے تھے۔ وہ نہایت زندہ دل، ٹلکفتہ مزاج اور مزاجیہ طبیعت کی مالک تھیں۔ یہی نہیں، وہ درسی تعلیم کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین بھی تھیں۔ میرے والد اپنی بہن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور مان بائی بھی اپنے سب سے چھوٹے بھائی جناح پر جان چھڑکتی تھیں۔ دنوں کے درمیان بے حد محبت تھی اور یہ ان کے آخری دنوں تک بدستور قائم رہی۔ جب میں قائد اعظم کے ساتھ اپنی چالیس سالہ رفات پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے بے ساختہ دوستی اور خلوص کے وہ رشتے یاد آ جاتے ہیں جو میرے عالد اور ان کی بہن کے درمیان قائم تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کئی سالوں بعد مان بائی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں مستقل رہائش پذیر ہونے کیلئے آئیں تو وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔

وہ قصے کہانیاں سنانے میں بڑی ماہر تھیں۔ مجھے آج تک حیرت ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں

کہانیاں آخر کس طرح زبانی یا درکار کر ق بوس گی۔ وہ کسی کوں نہیں گئی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ کہانیاں کتابوں وغیرہ سے پڑھ لیتی ہوں۔ غروب آفتاب کے بعد مان بائی پوفی میری بہنوں اور میرے رشتے کے بھائیوں (کنزز) کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیتیں۔ وہ ہماری توجہ کا مرکز بن جایا کرتیں اور ہم رات مبہوت اور مسحور ہو کر ان کی کہانیاں سناتے۔ وہ پریوں اور اڑنے والے قالینوں کے لئے کہانیاں سناتیں، جنوں اور بلاوں کے قصے ہوتے، اور یہ سب ہمارے نفحے منے ذہنوں کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوتے۔ یہ کہانیاں ہماری دنیا سے دور آباد کسی دوسرے ہی عالم کے واقعات معلوم ہوتے۔

ایک روز میرے والد، والدہ اور مان بائی پوفی سر جوڑ کر بیٹھے کہ آخر محمد علی کا کیا کیا جائے۔ جس نے اپنی تعلیم میں دلچسپی لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کی عمر دس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک اس نے گجراتی کی چوتھی جماعت بھی پاس نہیں کی تھی۔ مان بائی نے تجویز پیش کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ بھیتی لے جائیں گی، امید ہے ماحول کی تبدیلی سے اس کا دل پڑھائی کی طرف مائل ہو جائے گا۔ میری والدہ کو اس تجویز پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی اور انہوں نے بادل خواستہ اس کی اجازت دے دی۔ اس طرح محمد علی مان بائی پتفتی کے ہمراہ بھیتی چلے گئے۔

محمد علی کو بھیتی کے انجمن الاسلام سکول میں داخل کر دادیا گیا۔ کچھ عرصے تک محمد علی نے اپنی کتابوں پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کر لی۔ اس طرح وہ انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لینے کے اہل ہو گئے۔ ادھر والدہ کا اپنے چہیتے بیٹے کی جدائی میں براحال تھا۔ بالآخر مان کی محبت باپ کی منطق پر غالب آگئی اور محمد علی بھیتی سے کراچی واپس آگئے۔

میرے والد نے انہیں ایک مرتبہ پھر سندھ مدرسہ الاسلام میں داخل کر دیا۔ سکول کے

رجسٹر کے مطابق اس مرتبہ ان کا ولہ نمبر 178 تاریخ 23 ستمبر 1887ء تاریخ داخلہ تھی۔

گذشتہ تعلیمی ادارے کے خانے میں انجمن الاسلام سکول بمبئی کا نام درج ہے۔

اب تک محمد علی کو جنون کی حد تک گھر سواری کا شوق ہو چکا تھا۔ میرے والد کے پاس سواری کے لئے کئی بھی تھیں۔ جو اس زمانے کے مطابق سواری کا ایک ریسمانہ ذریعہ تھیں۔ موڑ کاروں کا دورا بھی بہت دور تھا۔ میرے والد کے اصل میں کئی شاندار گھوڑے تھے۔ محمد علی نے جلد ہی گھر سواری سیکھ لی۔ وہ اس کھیل سے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ سکول میں ان کے ایک دوست ہوا کرتے تھے۔ کریم قاسم جو کھارا درہی کے ایک تاجر کے بیٹے تھے۔ دونوں لڑکے اکٹھے روزانہ دور تک گھر سواری کیا کرتے تھے۔

محمد علی اپنے گھوڑوں سے پیار کرتے تھے جو گرد نیں تان کر سیدھے کھڑے ہوتے تھے، اور طاقت اور خود اعتماد کے مظہر ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ فطرت کے قاعدے کے تحت زندگی ہمیشہ ہمودی خطوط پر استوار ہوتی ہے۔ گھوڑے سیدھے اور تن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ درختوں کا حال بھی ایسا ہوتا ہے۔ شاخوں پر پھول عموداً کھلتے ہیں۔ انسان سیدھا کھڑا ہو کر چلتا ہے۔ اسی طرح پرندے اور درندے بھی۔ گنبد اور یمنار آسمان کو چھو لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں اصول بنالیا کہ وہ نہ صرف سامنے دیکھیں گے بلکہ اپنا سر بھی بلند رکھیں گے۔ وہ مشکلات کے آگے نہیں بھیکھیں گے، بلکہ ان کا یہ چیلنج قبول کر کے ان پر قابو پالینے کی جدوجہد کریں گے۔ وہ صنوبر کے اوپرے درخت کی مانست نہیں گے، طوفان جسے چھو سکتے ہیں، مگر جھکا نہیں سکتے۔

وہ سکول میں اپنے دن امتحان میں کامیابی کی کوششوں میں گذارنے لگے۔ ان کی شایمیں گھر سواری کے لئے واقف تھیں۔

مگر تبدیلی کی جانب ان کا ریجیسٹریشن ایک بار پھر قاب آیا اور انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ انہیں کسی دوسرے سکول میں داخل کر دیں۔ کچھ بحث و مباحثے کے بعد میرے والد نے ایسا کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی، سندھ مدرسہ کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ انگریزی کی چوتھی کلاس میں تھے تو 5 جنوری 1891ء کو انہوں نے اس سکول کو ایک مرتبہ پھر خیر باد کہہ دیا۔ ان کی اگلی درس گاہ لارنس روڈ کراچی کا سی ایم ایس ہائی سکول تھی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں مونخ الڈ کر سکول زیادہ پسند نہیں آیا۔ ایک بار پھر انہوں نے والد سے درخواست کی کہ انہیں واپس سندھ مدرسہ میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کی اس خواہش کے مطابق ایک ماہ بعد 9 فروری 1891ء کو انہیں تیسرا مرتبہ سندھ مدرسہ میں انگریزی کی چوتھی کلاس میں داخل کر دیا گیا۔

اب ان کی عمر پندرہ برس ہو چکی تھی اور میرے والد اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونے لگے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ آخر ان کا بیٹا کیا بنے گا۔

گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جزل میجر نے جواب تک میرے والد کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا، پیش کش کی کہ وہ محمد علی کولندن میں اپنی فرم کے صدر دفتر میں تین سال کے لئے اپنے کے طور پر بھجو سکتا ہے۔ وہاں اسے کاروبار کا نظم و نق چلانے کی عملی تربیت دی جائے گی۔ یہ تربیت لندن سے واپسی پر محمد علی کے لئے اپنے والد کا کاروبار سنبھالنے میں بہترین معاون ثابت ہو گی۔ جزل میجر کو یقین تھا کہ اس مرحلے پر یہ نوجوان اپنے والد کے لئے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہو گا اور وہ کاروبار کو مزید پھیلانے میں والد کا مددگار بنے گا۔ اس تجویز پر خوشحال تاجر کا دل بے حد خوش ہوا، جو قائل ہو چکا تھا کہ لندن میں ایسے بھرپور عملی تجربے کے بعد ان کا بیٹا خاندانی کاروبار میں یقیناً چند نئی اور منافع بخش را ہوں کا اضافہ کرے گا۔

مگر ان کے لئے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کا پرکتاب روپیہ صرف ہوگا، جس کے بعد طویل عرصے کے دوران تو شاید ان کے خاند انکو فوائد حاصل ہوں مگر بیٹھ کو اس قسم کی تربیت دلانے سے فوری طور پر فائدے کی بہر حال کوئی امید نہیں تھی۔ میرے والد نے اپنے انگریز دوست سے دریافت کیا کہ کراچی سے لندن میں قیام و طعام پر انہیں ماہانہ کس قدر رقم خرچ کرتا پڑے گی۔ متوقع اخراجات کے اعداد و شمار کا تفصیل اور احتیاط سے جائزہ لیا گیا۔ اگرچہ تین سال کے دوران خرچ کی جانے والی مجموعی رقم خاصی تھی۔ مگر میرے والد نے فیصلہ کیا کہ وہ میسر زگراہمز کے پاس لندن میں یہ رقم پیشگی جمع کر دیا کریں گے۔ تاکہ ان کا بیٹھا اپنی تربیت تسلیم کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ انہوں نے سوچا کہ کار و بار کی کامیابی تو ہوا کی طرح عارضی ہوا کرتی ہے اور یہ ہوا پیشگی اطلاع کے بغیر کسی بھی وقت اپنا رخ بدل سکتی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ایک بزنس میں جو سخت کوشی سے ابھر اتحا، کی داتائی بے حد سودمند ثابت ہوئی۔ اس کے بغیر لندن میں میرے بھائی کا کیریئر دفعتاً ختم ہو جاتا۔

مگر میری والدہ بدستور اپنے موقف پر قائم تھیں۔ وہ اپنے لاؤ لے بیٹھ کوئی برس کے لئے کس طرح خود سے جدا کر سکتی تھیں۔ والد نے انہیں سمجھایا کہ محمد علی کو لندن بھیجنانہ صرف خود ان کے نوجوان بیٹھے کے بلکہ خاندانی فرم جناح پونچا اینڈ کمپنی کے بھی مفاد میں ہوگا اور پھر یہ کہ تین سال کا عرصہ ایسا زیادہ بھی نہیں، یہ وقت جلد ہی گذر جائے گا۔ کئی روز کی تسلی دلason اور استدلال کے بعد بالآخر والدہ رضامند ہو گئیں، مگر اس رضامندی کے لئے انہوں نے ایک شرط عائد کر دی۔ ان کے نزدیک کسی غیر شادی شدہ نوجوان کو انگلستان بھیجننا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر محمد علی جیسے خوب نوجوان کا غیر شادی شدہ حالت میں وہاں جاتا بالکل صحیک نہیں تھا۔ والدہ کو اندر یہ شدہ تھا کہ محمد علی انگلستان میں کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کر لیں اور

اگر ایسا ہو تو یہ جناح پونچا خاندان کے لئے کم ہانے کے ہو گا۔ والدان کے دلائل سے متفق ہو گئے۔ مگر اب سوال یہ اٹھا کہ محمد علی کی شادی کہاں کی جائے۔

میری والدہ کے پاس اس سوال کا جواب پہلے ہی سے تیار تھا۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی شیعہ خاندان کو جانتی تھیں جن سے ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ ان کی ایک لڑکی ایسی بائی شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ والدہ کے خیال میں وہ محمد علی کی دہن بننے کے لئے بالکل موزوں تھی۔ میرے والد کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر والدین نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی اس فیصلے سے آگاہ کر دیں۔ اس زمانے میں بچوں کی شادیاں والدین ہی طے کیا کرتے تھے۔ لڑکی اور لڑکے کے پاس بڑوں کا فیصلہ قبول کر لینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً والدین جانتے تھے کہ ان کے بچے کیلئے کیا بہتر ہے۔

شاید قائد اعظم نے اپنی زندگی کا یہ واحد اہم فیصلہ کسی دوسرے کو کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ اپنی والدہ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان کی بات سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اپنے والد کی دنیاوی معاملات میں فہم و فراست پر اتنا بھروسہ تھا کہ انہیں یقین تھا کہ وہ شاید ہی کوئی غلطی کریں گے، اس زمان کے دستور کے مطابق انہوں نے ایک فرمانبردار بیٹے کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے والدین کا فیصلہ قبول کر لیا۔ اس طرح ان کی منگنی پانیلی کی ایسی بائی سے ہو گئی۔

اس موقع پر اس نوجوان نے، جس کی اپنی سوچ اور اپنی ایک مرضی تھی اور جو زندگی کی مشکلات میں سے اپنا راستہ بنانے کا عزم کر چکا تھا۔ کسی قدر تماں کا اظہار کیا، انہیں ایک ایسی لڑکی ساتھ شادی کرنے میں بنیادی طور پر اعتراض تھا کہ انہوں نے اسے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے بات کی تھی، مگر یہ اعتراض والدہ کی یقین دہانی کی دھوپ میں بلکل دھنڈ کی طرح

غائب ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بیان دلایا کہ اس قسم کے معاملات میں ماں کی دعائیں بہت بھاری ثابت ہوا کرتی ہیں جن کے نتیجے میں ایسی شادیاں بہت خوش و خرم اور پر سکون ازدواجی زندگی پر منتج ہوا کرتی ہیں۔

اس منگنی کے نتیجے میں بعد ازاں ان کی شادی ہوئی مگر اس سے قبل 30 جنوری 1892ء کو انہیں سندھ مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا جب کہ وہ انگلش کی پانچویں جماعت میں تھے، سکول کے ریکارڈ میں اس واقعہ کا اندر ارجیوں ملتا ہے:

”محمد علی جناح بھائی اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ جانے کے لئے سکول چھوڑ گئے۔“

19 اگست 1947ء کو گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر کے دوران انہوں نے اپنے بچپن کی سہانی یادیں تازہ کرتے ہوئے فرمایا:

”ہاں میں کراچی میں پیدا ہوا تھا اور لڑکپن میں کراچی ہی کی ریت پر گولیاں کھیلا کرتا تھا۔ میں نے سکول کی تعلیم کراچی میں حاصل کی تھی۔“

انہوں نے اپنی کوششوں سے بے پناہ تجربہ حاصل کیا تھا اور اسی لئے انہوں نے دوسروں کی جانب سے یہ کرو اور یہ نہ کرو یا ان کے لئے کیا اچھا ہے اور کیا اچھا نہیں ہے۔ جیسے احکامات قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ یہ عادت جوان میں بچپن ہی سے رائخ ہو چکی تھی۔ ان کے ذہن کے سیاسی ارتقاء کے ہیجان انگلیز زمانے میں بھی ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ مگر یہ تضاد انتہائی حریت کا باعث ہے۔ کہ شریک حیات کے انتخاب کے معاملے میں پسند یانا پسند کا اختیار انہوں نے کلیتہ اپنی والدہ کو دے دیا۔

میرے والد، والدہ، محمد علی، پوفی مان بائی اور کچھ دوسرے رشتہ دار کراچی سے بھری راستے سے ویراواں روانہ ہوئے وہاں سے محمد علی کی برات بیل گاڑیوں کے ذریعے ہمارے آبائی گاؤں

فاسلے غیر متوقع اور دلکش کہانیوں کو جنم دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ پانیلی کے سادہ لوح دیہاتیوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جناح بھائی کراچی جیسے بڑے شہر میں جا کر کروڑ پتی بن چکے ہیں، وہاں سے وہ یورپ اور مشرق بعید کے ممالک کے ساتھ تجارت کرتے ہیں اور ان کا مال سمندر میں بادبانوں کے بغیر چلنے والے جہازوں کے ذریعے ان دور دراز ملکوں کو بھیجا جاتا ہے اور یہ کہ جناح بھائی کا گھر بہت بڑا ہے۔ سواری کے لئے گاڑیاں اور گھوڑے ہیں۔ جی ہاں یہ سب ان سادہ لوح لوگوں کی خیال آرائی اور وہم تھا کہ جناح بھائی نے کراچی میں بے پناہ دولت کمائی تھی۔ پونچا گھرانے کو فخر تھا کہ (ان کی) ایک بہت بڑی بارات پانیلی آرہی ہے۔

میرے والد ان سب باتوں سے آگاہ تھے۔ وہ اپنے اہل خانہ اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور پانیلی میں آباد ہر گھرانے کے سربراہ کے لئے بہت سے تحائف لائے تھے۔ جب ان لوگوں کی تعداد اور ان کے لئے لائے جانے والے تحائف کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تحائف کی تعداد بہت کم تھی۔ اس پر میرے والد نے اپنے ایک کزن کو مزید تحائف لانے کے لئے گونڈل بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی خاصی تعداد میں گولے اور پٹانے بھی لائے تھے تاکہ خواب آلو د پانیلی ان کی گرج سے گونج اٹھے اور آنکھیں چندھیا دینے والی ان کی روشنی ار گرد میلوں دور آسمانوں پر بکھر جائے۔ اس زمانے میں بینڈ باجے نہیں ہوا کرتے تھے جنہیں پانیلی کی گلیوں میں گا کر ایک امیر آدمی کے بیٹے کی شادی کا فخریہ اعلان کیا جا سکتا۔ تاہم اس موقع کے لئے گونڈل سے نقارے بجائے والوں کو بلا یا گیا تھا۔ جو نہم دائرے کی شکل کے فقاروں کو دو پتلی چھڑیوں کی مدد

سے بجارتے تھے۔ نقاروں کے ماتھے سریل نہیں تھا۔ مگر ان کا شور اس قدر تھا اور ان کی آواز اور بازگشت ایسی تھی کہ اس سے پانیلی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ گونج اٹھا تھا۔ گاؤں کی عورتیں رسم کے مطابق کئی روز سے تھائے، کپڑے، زیورات اور مٹھائیاں وغیرہ دہن کے گھر لارہی تھیں۔ نقارے بجانے والے بارات کے آگے آگے تھے۔ جب کہ خواتین شادی بیاہ کے گیت گا تھیں اور رسم کے مطابق راستے میں شاول بکھیرتھیں، آہستہ آہستہ سے دہن کی گھر کی جانب روں دوں رہتھیں۔

ایک ہفتے تک گاؤں کے لوگ دوپہر اور شام کے اجتماعی کھانوں میں مدعو رہے۔ عام حالات میں آزمائش اور دلکشی سے محروم پانیلی میں اس شادی کے باعث اب ایک جشن کا سماں تھا۔ جیسے گونڈل کے دیہات میں سے یہ گاؤں ایک روز خواب سے بیدار ہوتے ہی دہن کی طرح سچ گیا ہو۔ میرے والد کو اخراجات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ آخر یہ ان کے پہلوٹھی کے بیٹے کی شادی تھی اور کے معلوم تھا کہ ان کے دوسرے بچوں کی شادیاں کراچی میں ہونا تھیں یا بمبئی میں۔ پوری سچ دھج سے کی جانے والی اس شادی سے ان کے اپنے گاؤں کے لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ والد کے کراچی واپس چلے جانے کے بعد پانیلی کے لوگوں نے کم از کم اتنا ضرور یاد رکھا ہو گا کہ اس گاؤں کی گلیوں میں کھینے والے دوسرے بچوں کی طرح عام سے جناح بھائی اب ایک بڑے شہر کے بڑے تاجر بن چکے تھے۔

جشن کے اس موقع پر دو لہا کے خیالات کیا تھے۔ اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی عمر بمشکل سولہ برس تھی اور ان کی شادی کی جارہی تھی۔ انہوں نے اپنی بہنوں اور کزنز کے علاوہ اس عمر کی کسی لڑکی سے کبھی بات تک نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے اپنی دہن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے طرز زندگی سے انحراف

ضرور کیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے خود کرنے کے پس گھنیوالے بہت گئے تھے۔ وہ اپنی والدہ کی صورت میں تقدیر کے آگے بے بس ہو گئے تھے، جنہوں نے ان کی شادی ایسی بائی سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

نظر نہ آنے والے سفید دھاگوں میں پروئی ہوئی پھولوں کی لمبی لمبی لڑیوں میں سرے پاؤں تک چھپے ہوئے محمد علی پانیلی میں اپنے دادا کے گھر سے دلوہا بن کر بارات کے جلوس کے ہمراہ اپنے ہونے والے سر کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں چودہ سالہ ایجی بائی قیمتی نے ملبوسات اور بھاری بھر کم زیورات پہننے ہاتھوں میں مہندی رچائے دہن بنی بیٹھی تھی۔ اس لے لباس اور چہرے پر نہایت قیمتی عطر چھڑکا ہوا تھا۔ گاؤں کے مولوی صاحب نے رسم نکاح ادا کی۔ قرآن حکیم سے چند آیات کی تلاوت کی گئی اور یہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔

میرے والد کو کراچی سے گئے چار ہفتے ہو چکے تھے اور ان دونوں مواصلات کے ذریعے بہت محدود تھے۔ ان کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ وہ پانیلی میں بیٹھئے کراچی میں اپنے کار و بار کے متعلق فکر مند ہونے لگے۔ ان کی جانب سے بے صبری اور گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا اور انہوں نے اپنا فیصلہ نہادیا کہ وہ جلد از جلد کراچی واپس جانا چاہتے ہیں۔ مگر سماجی رسوم کی اپنی ایک طاقت ہوا کرتی ہے۔ اور خاص طور پر پرانے زمانے میں ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ اور بھی سخت تھیں۔ معاشرتی رسم و رواج کو توڑنا مقدس مذہبی روایات کو پامال کرنے کے متراوٹ سمجھا جاتا تھا۔ میرے بھائی کے سرال والے روایات کی سختی سے پیروی کرنے والے لوگ تھے۔ اور انہوں نے یہ بات شائستگی مگر پوری شدت کے ساتھ اپنے سہی جناح بھائی پر واضح کر دی تھی کہ ان کی بیٹی دہن بننے کے بعد ان کے گھر میں اگر تین ماہ تک ممکن نہ ہو تو کم از کم ایک ماہ تک قیام کی ضرورت کرے گی۔ اس کے بعد ہی اسے اس کے دلہما کے ساتھ کراچی جانے کی اجازت

دی جاسکتی ہے۔ میرے والد کے لئے اتنا حصہ پانیل میں قیام کرنا ممکن نہیں تھا اور وہ کراچی واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ادھر میری والدہ اپنے شوہر کو تھنا کراچی واپس جانے کی اجازت دینے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ وہ بے حد مصروف آدمی تھے۔ وہ اتنا زیادہ اور گھنٹوں کام کرتے تھے۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ والدہ ان کے ہمراہ کراچی واپس آ جاتیں۔ گھر بار سنبھالتیں، والد کے لئے کھانا وغیرہ بناؤ کر گرم گرم ان کی خدمت میں پیش کرتیں۔ نوکروں پر کون اعتبار کر سکتا ہے؟ وہ نہ صرف صفائی کا خیال نہیں رکھتے بلکہ کھانا بھی اچھا نہیں بناتے اور نہ ہی وہ رات کو صاحبِ خانہ کی آمد کو دیر تک انتظار کر سکتے ہیں اور نہ رات کو ان کی واپسی پر گرم گرم چپاتیاں بناؤ کر دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں والدہ بھی پانیلی میں مزید نہیں رک سکتی تھیں۔ البتہ محمد علی پانیلی میں رک سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے سرال والے انہیں ان کی دہن کو لے کر کراچی جانے کی اجازت دے دیتے۔ مگر میرے بھائی بھی والدین کے ساتھ ہی کراچی واپس جانے کو بے تاب تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے بندھن سے باہم وابستہ ہونے والے دونوں خاندانوں کے درمیان اس مسئلے پر گرم بحث شروع ہو گئی۔ دونوں خاندان کئی روز تک باہم مل بیٹھ کر مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر اختلافات ختم نہ ہوئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی لانچل معاملے میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ اس تمام گفت و شنید کے دوران محمد علی اب تک خاموش رہے تھے۔ ان کی حیثیت اکھاڑے کے باہر بیٹھنے والے شخص کی سی تھی۔ اور اکھاڑے کے اندر خاندانی جھگڑے کو نمائانے کے لئے کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مگر جب انہیں یقین ہوا کہ بات چیت تعطل کا شکار ہو گئی ہے۔ تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود معاملے کو نمائیں گے۔

اپنے والدین کو بتائے بغیر محمد علی اپنے سر اور خوش دامن سے ملنے چلے گئے۔ ان لوگوں

نے رسم و رواج کے مطابق اپنے والوں کا گر بھوش نے خیر قدم کیا اور ان کی خوب خاطر و مدارات کی۔ انہیں بتائے بغیر کہ وہ کس مقصد کیلئے ان کے پاس آئے ہیں، محمد علی ان کے ساتھ کچھ دیر پہنچنے رہے۔ ان کی سرال والوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ ان کا داماد کس قدر مہذب، خاموش طبع اور فرماتہ بدار ہے۔ استقبال اور خوش آمدید وغیرہ کی رسومات مکمل ہو جانے کے بعد محمد علی نے نہایت پختہ لجھے میں بات کا آغاز کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے والدین پانیلی میں مزید قیام نہیں کر سکتے۔ اور انہیں لازمی طور پر کراچی واپس جانا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی ان کے ساتھ ہی جائیں گے۔ وہ اپنی دہن کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں اور یہ کہ انہیں امید ہے کہ دہن کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق کوئی فیصلہ کیا تو نحیک ہے ان کی مرضی۔ میرے بھائی نے کہا کہ وہ انہیں (اپنے سرال والوں کو) یہ بتانے آئے ہیں کہ اس صورت میں وہ اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے کراچی بھجو سکتے ہیں۔ دہن کے والدین اس نوجوان کی اپنے سرال والوں سے اس قدر بے باکانہ گفتگو پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے اپنے داماد کو حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے غیر متوقع طور پر مضبوط لجھے اور صاف گوئی پر انہیں بہت حیرت ہوئی۔ تاہم محمد علی نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ وہ جلد ہی تین برس کے لئے کراچی سے یورپ روانہ ہو جائیں گے۔ شاید دہن کے والدین اسے اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں کراچی بھیجیں اور اسے تین سال تک ان کی انگلینڈ سے واپسی کا انتظار کرنا پڑے۔

نوجوان بیٹا اس مسئلے کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جس میں اس کے والدین کو ناکامی ہوئی تھی۔ اگلے ہی روز محمد علی کے سر اور خوش دامن میرے والدین سے ملنے آئے اور بڑی فکر مندی سے پوچھا کہ وہ ایکی بائی کو کب کراچی لے جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی رخصتی کے لئے

ضروری انتظامات کر سکیں۔ دونوں یا ہر دونوں کے درمیان انتقال اور تخلی کی جگہ خیر سگا لی کی فضا  
حوال ہو چکی تھی۔

ہماری خاندانی روایت کے مطابق ایسی بائی کو اپنے سر کے سامنے آنے کے لئے ہر بار  
گھونگھٹ نکالنا تھا۔ یہ خاوند کے بڑوں کے احترام کی علامت ہوتا تھا۔ مگر اس قسم کے معاملات  
کے بارے میں محمد علی کے اپنے نظریات تھے۔ ان کی بیوی انکے والدین کی بہو ہونے کے ناطے  
ان کی بیٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اب وہ ان کے خاندان ہی کی ایک فرد تھی اور صرف اس  
بنیاد پر بڑوں کے سامنے آنے کے لئے گھونگھٹ نکالنے کا تکلف کرنا کہ ان کی دادی یا نانی ایسا  
کیا کرتیں تھیں۔ محمد علی کے نزدیک غیر ضروری تھا۔ میرے والد نے بھی اپنے نوجوان بیٹے کے  
خیالات کی حمایت کی۔ اس روز سے ایسی بائی نے صدیوں پرانی یہ روایت ترک کر دی جو  
ہمارے خاندان میں نسل درسل آرہی تھی۔

میری والدہ بیٹے سے تین برس کی جدائی کے تصور ہی سے کھوئی کھوئی رہتی تھیں، ان کے  
لئے یہ بہت طویل عرصہ تھا۔ مگر انہوں نے اس جدائی کو محمد علی کی بہتری کے خیال سے قبول کر لیا  
تھا۔ انہوں نے اس سے کہا: میرے بیٹے میں تم سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ  
انگلینڈ جا کر تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ یہ میری زندگی کا خواب ہے۔ ان کا بیٹا خاموشی  
سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے کہا: محمد علی تم ایک لمبے سفر پر جا رہے ہو، ایسا لگتا ہے کہ میں  
تمہیں انگلینڈ سے واپس آتا دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہوں گی اور اس کے بعد وہ سکیاں لے  
کر رونے لگیں۔

محمد علی نے جذباتی ہو کر والدہ کو گلے لگالیا۔ میری والدہ نے بیٹے کو ایسا لکھا: محمد علی، خدا تمہاری  
حافظت کرے گا۔ وہ میری خواہش کو ضرور پورا کرے گا۔ تم بڑے آدمی بنو گے اور مجھے تم پر فخر ہو گا۔

## تاجر سے بیرون ہٹنے تک

قطب نما چارٹوں اور ستاروں کی مدد سے سمندر کی لہروں پر سفر کرنے والا جہاز اپنی منزل انگلستان کی جانب رواں تھا۔ اور میرا بھائی ایک یکسر اجنبی ملک میں نئی زندگی کے بھر بیکراں میں داخل ہو رہا تھا۔ چند ایک بچوں کے سوا جو اپنے والدین کے ہمراہ اس جہاز میں سوار تھے، محمد علی اس جہاز کا سب سے کم عمر مسافر تھا۔ 1890ء کے عشرے میں ایک عام ہندوستانی کی زندگی میں انگلستان کا سمندری سفر نہایت غیر معمولی اور بڑا اواقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے ہی سولہ سال کے اس نوجوان کی تن تھیں۔ بھری جہاز پر موجودگی بہت سے لوگوں جن میں اکثریت انگریزوں کی تھی، کے لئے بڑی حیرت اور تعجب کی بات تھی۔ انگریز مسافروں میں سے ایک اس یہاں تھی کہ اس نوجوان پر مہربان ہو گیا۔ جس کی ظاہر شک و صورت میں لڑکپن کی جھلک بدستور نمایاں تھی مگر جس کے اندر اپنی عمر سے کہیں بڑے شخص کی خود اعتمادی موجود تھی۔ اس انگریز نے محمد علی سے پوچھا کہ وہ کس غرض سے انگلینڈ جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ وہاں کسی کو جانتے ہیں۔ انگلینڈ میں ان کا قیام کہاں ہو گا۔ اور وہ زندگی میں کیا بنتا چاہتے ہیں۔ نوجوان محمد علی نے اس بوڑھے انگریز کو

کافی متاثر کیا، جو اس کے ساتھ اپنے بیلے کا سارہ برا کر رہا تھا۔ وہ انگریز روزانہ زیادہ تر وقت میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں گزارتا اور انہیں اللدن کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہتا جو اس کے خیال میں میرے بھائی کے لئے مفید ہو سکتی تھیں۔

اس زمانہ میں بھری جہازوں کو سبیلی سے انگلستان پہنچنے میں تین ہفتے لگتے تھے۔ راتے میں جہاز چند ایک بندرگاہوں پر رکتے تھے۔ اور مسافر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ساحلوں پر سیر و تفریح اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو لیتے تھے۔ جہاز جب پورٹ سعید پر رکا تو بوڑھے انگریز نے میرے بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بٹوے کے بارے میں ہوشیار رہیں، جس میں نقدی تھی۔ اس نے کہا: ”پورٹ سعید پر آپ کو لازمی طور پر محتاط رہنا ہوگا۔ یہاں کے لوگوں کی انگلیاں بہت تیز ہوتی ہیں، وہ آپ کا پرس نکال لیں گے اور آپ کو پتہ تک نہیں چلے گا۔“ محمد علی نے احتیاطی طور پر تھوڑی سی رقم جیب میں رکھ لی۔ اور اس بوڑھے انگریز کی نصیحت کو اپنے احساس ذمہ داری اور چوکسی کے لئے ایک چیلنج کے طور پر قبول کر لیا۔ وہ بظاہر لاپرواہ بنے تھا پورٹ سعید کی گلیوں میں نکل گئے۔ مگر اندر ہی اندر وہ کسی بھی جیب کترے کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے اور ہر قدم دیکھ بھال کر اٹھا رہے تھے۔ شام ڈھلنے جہاز پر واپس آ کر انہوں نے بوڑھے انگریز کے ساتھ پورٹ سعید، اس کے لوگوں اور سمندری ہواویں کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد آخر میں کہا: ”آپ نے دیکھا سر میرا بٹوہ ابھی تک محفوظ ہے۔ میں بے حد محتاط رہا ہوں۔“

”ماں بوائے! یہ ہوئی نا بات۔ زندگی میں ہر چیز کے بارے میں محتاط رہنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔“

مارسیلز کی بندرگاہ پر اترتے ہوئے اس نے میرے بھائی کو لندن میں اپنے گھر کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ کبھی کبھار اس سے ملتے رہیں۔ اگلے چار برسوں کے دوران جب یہ بزرگ انگریز

ہندوستان سے واپس اپنے گھر انگریز آتا تو وہ یہ رے بیان کو اپنے گھر دعوت دیتا کہ وہ اس کے اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ کھانا کھائیں۔

محمد علی ساؤ ٹھیمپن میں جہاز سے اترے، جہاں سے انہیں لندن جانے والی گاڑی میں بیٹھنا ہوتا تھا۔ جب وہ بگھی میں سوار ہو کر شہر کی وسیع و عریض سڑکوں پر نکلے تو اس پر شکوہ دار الحکومت نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ آخر بگھی اس ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رک گئی جس میں انہیں بگھی کے سائیں نے تھہر نے کامشوہ دیا تھا۔ یہ بہت ستا ہوٹل تھا مگر اس کے باوجود اس میں ایک بجی گھر کا سا آرام اور اچھی عمدہ خوراک میسر تھی۔ وہ ہوٹل کے استقبالیہ میں گئے اور رہائش کے لئے مناسب کمرہ مانگا۔ استقبالیہ کلرک نے اس نوجوان ہندوستانی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اور ناقابل یقین لبجے میں پوچھا: ”نوجوان کیا آپ اس کے واجبات ادا کر سکیں گے۔؟“

”یقیناً، یقیناً۔“ محمد علی نے اعتماد سے جواب دیا۔

”مگر مجھے امید ہے کہ واجبات مناسب ہوں گے۔“

تحوڑی دیر بعد ان کا سامان ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

میرے والد نے روانگی سے قبل انہیں لندن میں مقیم و حضرات کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے۔ قدرتی طور پر محمد علی سب سے پہلے ان دونوں حضرات سے ملنا چاہتے تھے مگر انہیں یہ جان کر کافی پریشانی ہوئی کہ وہ دونوں حضرات ان دونوں لندن سے باہر گئے ہوئے تھے۔

سردی اپنے عروج پر تھی اور محمد علی نے محسوس کیا کہ لندن میں زندگی قدرے ادا کی کاشکار تھی، وہ اس قدر شدید موسم کے عادی نہیں تھے۔ وہ روزانہ بگھی پر اپنے ہوٹل سے دفتر جانے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں لندن کے بھیکے ہوئے سرد موسم میں کافی فاصلہ

” یہ تجربہ بھی خوب تھا۔ میں جوان اور تہا تھا۔ اپنے گھر اور والدین سے ہزاروں میل دور ایک ایسے ملک میں مقیم تھا جہاں کی زندگی کراچی کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ جس کا میں عادی تھا۔ گراہمز اینڈ کمپنی کے صدر دفتر میں، جہاں میں کام کرتا تھا، چند لوگوں سے علیک سلیک کے سوا میں کسی کو جانتا تک نہیں تھا۔ لندن جیسے شہر کے بڑے پن کامیرے جیسے تہا شخص پر بہت گہرا دباؤ تھا۔ شدید سردی اور موسلادھار بارشوں سے میرے پٹھے اور ہڈیاں تک نج ہو جاتی تھیں اور میں خود کو بہت حد تک تکلیف میں محسوس کرتا تھا۔ مگر پھر میں لندن کی زندگی کا عادی ہو گیا۔ اور میں نے جلد ہی اسے پسند کرنا شروع کر دیا۔“

گراہمز شپنگ اینڈ ٹریننگ کمپنی میں جس کا صدر دفتر تھری ٹینڈل شریٹ کے پاس تھا، اس نوجوان نے اپنے کا چارج سنپھال لیا، جو کمپنی کے کراچی میں مقیم ایک تاجر رومسٹ کا بیٹا تھا۔ محمد علی کو ایک کمرے میں چھوٹی سی میز لگ کر سی دسی گئی۔ جہاں بیٹھ کر دفتری ساتھیوں کی مدد سے کاروبار کا نظم و سق چلانا سیکھا کرتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نقدر رقم لائے تھے، میرے والد نے گراہمز اینڈ کمپنی سے کہا کہ وہ کراچی سے اپنے لندن دفتر میں مزید رقم منتقل کر دیں۔ ان کے بیٹے کے پاس اپنی اپنے شپ کمبل کرنے کے دوران کافی رقم موجود رہنی چاہئے، روپے پیسے کے معاملے میں احتیاط انہیں خاندانی درٹے کے طور پر ملی تھی۔ چنانچہ محمد علی نے لندن میں اپنی رقم رائل بنک آف سکاٹ لینڈ 123- بیٹ پ گیٹ شریٹ میں جمع کروادی۔ جلد ہی انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ انہیں لندن میں کم از کم دو برس ضرور رکنا پڑے گا۔ اس لئے ہوٹل میں ٹھہرنا مالی لحاظ سے ستانہیں رہے گا۔ اور یہ کہ اگر وہ کوئی ایسا خاندان تلاش کر لیں جو انہیں اپنے ساتھ ادا یگی کرنے والے مہمان کی حیثیت سے رکھ لے تو اس پر بہت کم اخراجات ہوں گے۔ لندن کے روز ناموں کے مختصر

اشتہارات کے کالموں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے پھر ایک خاندانوں کے پتے نوٹ کرنے جو پینگ گیٹ رکھنے پر آمادہ تھے۔ اس قسم کے کئی گھر انوں سے ملاقات کرنے کے بعد انہوں نے مزایف اپیچ ڈریک کے ہاں تھبرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا مکان 35 رسل روڈ کینٹنمنٹ میں موجودہ وسیع و عریض اولپیا بلڈرز کے بال مقابل ہائی سٹریٹ کینٹنمنٹ میں واقع تھا۔ اولپیا بلڈنگ 1892ء سے کہیں بعد میں تعمیر ہوئی تھی۔ آج بھی یہ جگہ لندن میں رہائش کے لئے بہت مناسب ہے جو ایف سی ریلوے لائسون کے سیکشنوں اور کراس سیکشنوں سے بلندی پر کینٹنمنٹ کے مرکزی علاقے میں واقع ہے۔ 1890ء کے عشرے میں یہ لندن کے رہائشی علاقوں کی ان چند جگہوں میں شامل ہو گی، جہاں رہائش کے متلاشی لوگ اکثر آتے رہتے ہوں گے۔ چند سال پہلے لندن کا ڈنٹی کوسل نے اس بلڈنگ پر ایک یادگاری تختی نصب کرادی تھی جس پر یہ عبارت تحریر ہے:

”قائد اعظم محمد علی جناح (1876-1948ء) بانی پاکستان نے یہاں 1895ء میں قیام کیا۔“

ان کا متحس ذہن اس وقت انگلینڈ میں اپنے قیام سے بھر پور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جبکہ برطانوی آزاد خیالی اپنی قوم کے ذہنوں پر گہرا اثر مرتب کر رہی تھی۔ انہوں نے اٹھتے ہی صحیح کے اخبار بڑی احتیاط سے پڑھنے اور اپنا ناشتہ ختم ہونے سے پہلے انہیں پڑھ لینے کی مخصوص انگریزی عادت اپنالی تھی۔ وہ بڑے لیدر جو انگلینڈ کے سیاسی افق پر چھائے رہے، محمد علی ان کی کامیابیاں اور پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر ہونے والی ان کی تقریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے۔ جو لاکھوں دوسرے افراد بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے، ان ہی سیاسی لیدروں کے تازہ ترین بیانات اور تقاریر کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھی جنہیں عام لوگ اس

عہد کی تاریخ کے تقدیر سازوں کی بحثیت میں تھا کہ محمد علی  
ٹھریڈینڈرل کے قریب واقع گراہمز اینڈ کمپنی کے دفتر میں معمول کے خشک اور اکتا دینے  
والے دفتر کام میں صبح سے شام تک الجھے رہتے تھے۔ اس تمام تر محنت، مشقت اور صبر کا شاید  
واحد انعام یہ مل سکتا تھا کہ وہ بالآخر اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہو جاتے، اور اسے اس  
معیار سے زیادہ منافع بخش اور وسیع تر بنانے لگ جاتے جس پر انہوں نے اسے سنبھالا تھا۔ ان  
کے نزدیک زندگی کا یہ انتہائی بور اور محدود مستقبل تھا۔ ان کی زندگی میں روپے پیسے کی اہمیت  
ضرور تھی مگر موجودہ صورت میں وہ اپنی قوم کے رہنمائیں بن سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ اپنے ہم  
وطنوں کی زندگیاں بہتر بنانے والے ہیروین بن سکتے تھے۔ اس خیال نے ان کے ذہن میں بہت  
سے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے تھے۔ کہ آیا انہیں ایسے کیریئر میں جانے کیلئے خود کو تیار کرنا  
چاہئے۔ جوان کے ساتھ ہی شروع ہوا اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ انہوں نے انگریزوں  
کی عوامی زندگی کے موجودہ اور ماضی کے لیڈروں کی زندگی کا مطالعہ کرنا اور ان کے بارے میں  
لوگوں سے بحث کرنا شروع کر دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان رہنماؤں میں سے اکثر یہ سڑ تھے اور  
یہ کہ قانون کے مناسب اور خاطر خواہ علم نے انہیں عوامی زندگی میں اہم مقام حاصل کرنے میں  
بڑی مدد دی تھی۔

اب وہ دورا ہے پر کھڑے تھے۔ کیا انہیں بحثیت اپنی گراہمز میں کام کرتے رہنا  
چاہئے یا وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے لندن کی کسی انجمن میں داخلہ لے لیں اور بیرسٹر بن جائیں  
۔ انہوں نے بتایا: ”مجھے یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ مجھے بیرسٹر بننے کے لئے تیار ہونا  
چاہئے۔ میری خوش قسمتی کہ جس سال ”لٹل گو“ کا امتحان پاس کر کے بار ایٹ لاء میں داخلہ لینے  
کا آخری موقع تھا۔ نئے سال سے داخلے کے قواعد و ضوابط میں تبدیلیاں کی جا رہی تھیں، جس

کے باعث بارائیٹ لاء میں داخلہ لینے کی ایک ممکنہ مزید دو برس لگ جاتے۔ چنانچہ میں نے لفل گو کا امتحان پاس کرنے کے لئے گراہمز میں اپنی شپ کا سلسلہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔“

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے مستقبل کے بارے میں ان کا یہ فیصلہ انتہائی اہم تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جو ان کی زندگی کا دھارا بدل دینے والا تھا۔ ان کے نوجوان ذہن میں بلند نظری اور کچھ کرگذر نے کا شعلہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اپنے ملک کی عوامی زندگی میں اپنے لئے خود جگہ بنانے کا تھیہ کر چکے تھے۔ چنانچہ اس موقع کے حصول کے لئے انہوں نے اپنا تمام تر وقت اور تو انسیاں وقف کر دیں۔ ان کی دنیا اب یکسر بدل چکی تھی اور وہ اپنی کتابیوں کے ساتھ گویا چپ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی محنت کا صدر انہیں جلد ہی مل گیا۔ انہوں نے ”لفل گو“ کا امتحان نمایاں انداز میں پاس کیا اور بارائیٹ لاء کرنے کے لئے لکنڈ ان میں داخلہ لے لیا۔ لکنڈ ان میں داخلہ لینے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا:

”یہ ان دونوں کی بات ہے جب میں ”لفل گو“ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے یہ امتحان پاس کرنے کا پنچتارا دہ کر رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ امتحان پاس کر لوں گا۔ میں نے لندن کی تمام انز میں جانے اور ان میں زیر تعلیم طلباء سے ملنے کا سوچا، تاکہ ان میں سے کسی میں داخلے کے لئے آپ کو پہلے ہی سے تیار کر لوں۔ اپنے استفسارات اور مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال کے نتیجے میں میں نے لکنڈ کی بجائے ایک دوسری ان میں داخلہ لینے کا دل میں فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد میں نے لکنڈ ان کے صدر دروازے پر دنیا کی نامور قانون ساز شخصیات کے ضمن میں اپنے عظیم پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بھی کندہ کیا ہوا دیکھا۔ چنانچہ اس موقع پر میں نے ایک طرح کی منت مانی یا عہد کیا کہ ”لفل گو“ میں کامیابی کے

میرے پاس آج بھی ان کی 1892ء سے 1896ء کے عرصے کی وہ بُنک پاس بُک موجود ہے جس پر انہوں نے ہاتھ سے اپنا نام لکھا تھا: ”محمد علی جناح بھائی“ رائل بُنک آف سکاٹ لینڈ کی اس پاس بُک میں ایک ایسا اندر راج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی فیس داخلہ کے لئے 7 جون 1895ء کو لنکزان کو 19.138 پونڈ مالیت کا چیک دیا تھا۔ اس طرح سترہ برس کی عمر میں وہ بار ایٹ لاء کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، جبکہ کراچی میں میرے والد کو امید تھی کہ ان کا بیٹا جلد ہی لندن سے واپس آ کر کار و بار سنبھالے گا اور اس میں مزید و سعیں پیدا کرے گا۔

جونبی میرے والد کو پتہ چلا کہ ان کے بیٹے نے لنکزان میں داخلہ لے لیا ہے اور اسے پیر سڑر بننے میں برس لگیں گے تو میرے والد نے انہیں لکھا کہ وہ اس غیر منافع بخش کام کو ترک کر کے فوراً گھر آ جائیں، سخت الفاظ پر مبنی خط کے باوجود جواب میں بھائی نے ملتجیانہ انداز میں والد صاحب کو لکھا کہ انہیں انگلینڈ میں بار ایٹ لاء کی تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ انہوں نے مزید یقین دہانی کرتے ہوئے والد کو لکھا کہ ان کی تعلیم کے لئے مزید رقم بھجوانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ وہ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کریں گے اور اپنے اخراجات کو کم سے کم رکھیں گے۔ تاکہ والد صاحب نے ان کی دو سال تربیت کے لئے جو رقم دی تھی، اس سے چار سال تک کے اخراجات پورے کئے جائیں، اگرچہ میرے والد اپنی مرضی کے مالک بیٹے کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ تاہم انہوں نے اس صورت حال سے سمجھوٹہ کر لیا اور بہتری کی دعا اور امید کرنے لگے۔ قائد اعظم کے کراچی سے انگلینڈ جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی بیوی ایگی بائی انتقال کر گئی۔ محمد علی اپنی کمسن دہن کے ساتھ زیادہ طویل عرصہ تک نہیں رہے تھے جس کے ساتھ انہوں نے والدین کے کہنے پر شادی کی تھی، اس لئے انہیں اپنی الہیہ کے انتقال کا بہت زیادہ صدمہ نہیں ہوا

تحا۔ مگر لکنزاں میں تعلیم کے دوران بہت نہیں ان کی والدہ کے انتقال کی خبر ملی، جو میرے سب سے چھوٹے بھائی بندہ علی کی ولادت کے بعد رحلت کر گئی تھیں، تو یہ صدمہ محمد علی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ مرحومہ ماں کے لئے گھنٹوں سکیاں لے لے کر روتے رہے جو انہیں دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر تھیں۔ ان کی حساس طبیعت بے حد غمگین ہو گئی اور یہ صدمہ انہوں نے نہایت شدت سے برداشت کیا۔ وہ گھر سے بہت دور تھا تھے اور والدہ کے آخری دنوں میں ان کے پاس نہیں رہ سکے تھے۔ اس صدمے سے ان کا بہت براحال ہوا۔ اور انہیں بے ہوشی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ آخر کار ان کی والدہ کا وجدان درست نکلا۔ اور ان کی پیش گوئی پوری ہو کر رہی۔ وہ اپنے چہیتے بیٹے محمد علی کو لندن سے کراچی واپسی سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔ قائد اکثر بڑی محبت سے اپنی والدہ کی پیش گوئی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کہ ایک دن وہ بڑے آدمی بن کر رہیں گے۔ ایک گمنام نوجوان کی حیثیت سے انہیں اپکھر حیرت ہوا کرتی تھی کہ کیا ان کی والدہ کی پیش گوئی کبھی واقعی پوری ہو سکے گی۔ کیونکہ ابھی تک ان کی زندگی گمانی میں گذر رہی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ مستقبل نے ان کیلئے اپنے دامن میں کیا کچھ چھپا رکھا ہے۔

میری والدہ کے انتقال کے بعد میرے والد کے کاروبار کو یکے بعد دیگر دھپکے لگنے شروع ہو گئے اور یہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہننا اور زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ اب میرے والد قبل از وقت بڑھے ہو جانے والے ایک رندوے شخص تھے۔ جن کے چھ بچے تھے، کچھ جوان ہو چکے تھے اور کچھ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ جنہیں دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں صرف محمد علی ان کا سہارا بن سکتے تھے مگر وہ ابھی لندن میں بیرشٹر کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرے بھائی کے علم کے بغیر والد نے ان کے نام پر الگ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ یہ کاروبار بھی بھاری خسارے میں جا رہا تھا۔ میرے والد بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے ان ہی پریشانیوں

کے بارے میرے بھائی کو دلسو رخلوڑا لکھ جھائی نے لندن سے جواب میں لکھا کہ  
انہیں پریشا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ہندوستان واپس آ کر صورت حال کا مقابلہ کریں  
گے اور والد صاحب کے خاندانی وقار اور نیک نامی کو بچالیں گے۔

بھائی (قاںد) کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی۔ جب وہ اپنی ماں اور اپنی بیوی سے جدائی کا  
صد مہہ برداشت کر چکے تھے۔ اور اب وہ جانتے تھے کہ ان کا بڑا خاندانی کار و بار جسے ان کے  
والد نے بے پناہ محبت اور جانشناختی سے کھڑا کیا تھا، تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ بعض  
وقات زندگی کے بڑے بڑے صدمات اور ٹھوکریں بعض افراد کی غیر معمولی اور خوابیدہ  
صلاحیتوں کو بیدار کر دیا کرتی ہیں۔ بھائی (قاںد) نے اپنے خاندان کا نام اور روشن کرنے کے  
لئے ان مصائب اور نقصانات کا مقابلہ یونانی فلسفی زینو کے ایک پیروکار کی اسی جرات سے کیا اور  
کامیابی کا عزم کیا اور اب انہوں نے اپنा� نام بدل کر ”ایم اے جناح“ کر لیا۔

بنک کی پاس بک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مزایف ای اچیج ڈریک کو معاوضہ پر رہنے  
والے مہمان کی حیثیت سے دس پونڈ ماہانہ ادا کرتے تھے۔ بعد کے دنوں میں وہ کہا کرتے تھے  
کہ مزیج ڈریک ایک مہربان بوزی خاتون تھی جس کا کنبہ کافی بڑا تھا۔ وہ خاص طور پر ان سے  
بڑی محبت کرتی تھی اور انہیں اپنے بیٹے ہی کی طرح سمجھتی تھی۔ مز ڈریک کی ایک انتہائی حسین  
و جمیل بیٹی تھی، جو قائد کی ہم عمر تھی، خوبصورت اور مس ڈریک میرے بھائی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی مگر  
وہ اس ناٹپ کے نہیں تھے جو اس قسم کے معاشقوں وغیرہ میں خود کو ملوث کرتے جبکہ مس ڈریک  
میرے بھائی پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ ہر وقت ان کا دل جیتنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ مگر وہ  
ہمیشہ اس کے ساتھ قابل احترام حد تک فاصلہ رکھتے تھے۔ مس ڈریک کبھی کبھی اپنے گھر میں  
مخلوط پارٹیاں بھی منعقد کرتی تھی اور ان میں دوسرے کھیلوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مہمانوں

کے لئے مغربی انداز کے اس خصوصی کھیل کا بھی اہل اکر قائم تھی جس میں کسی خاص جگہ پر چھپنے والے کے پکڑے جانے کی صورت میں جرمانہ کے طور پر بوسہ لینا پرتاب تھا۔ مس ڈریک کی مسلسل کوشنشوں کے باوجود قائد بوسہ بازی کے اس کھیل میں کبھی شامل نہ ہوئے۔ قائد نے مجھے بتایا ”کہ مس کا موقع تھا اور ڈریک خاندان اسے روایتی جوش و خروش سے منا رہا تھا۔ جیسا کہ عیسائی خاندانوں میں رواج ہے۔ آکاں بیلیں گھروں کے دروازوں پر لنک رہی تھیں۔ جن کے نیچے ان لوگوں کو ایک دوسرے کا بوسہ لینے کی اجازت ہے۔ میں اس رسم سے باخبر نہیں تھا اور اتفاق سے ایک آکاں بیل کے نیچے کھڑا تھا کہ مس ڈریک نے مجھے پکڑ کر گلے لگا لیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کا بوسہ لوں۔ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ ہمارے معاشرے میں نہ تو ایسا کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس انداز میں پیش آیا تھا، کیونکہ اس روز کے بعد مجھے اس کی نظرے بازی کی الجھن سے نجات مل گئی۔“

لکنزان میں تعلیم کے دوران قائد اعظم ”کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ انہوں نے برٹش میوزیم لاہوری کے لئے ایک ریڈر کی حیثیت سے لکٹ حاصل کیا اور اپنا وقت اپنے ذہن کو وسیع اور جامع مطالعہ سے مالا مال کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ کبھی کبھی وہ اتوار کی صبح مشہور زمانہ ہائیڈ پارک میں چلے جاتے اور وہاں کے ایک مخصوص گوشے میں حامیانہ انداز میں خطاب کرنے والے مقررین کی تقاریر سنائیں کرتے جن کے باعث ہائیڈ پارک کے اس حصے کو ایک ادارے کی حیثیت سے عالمی شهرت حاصل ہوئی ہے۔ ان غیر ذمہ دار مقررین کی جذباتی اور بے ربط تقریریں سن کر جو اکثر نہایت مضر انداز میں اپنی ہی حکومت پر تغییر کیا کرتے تھے۔ قائد کو کسی بھی قوم کے لئے آزادی اظہار کی اہمیت کا احساس ہوا جس کے بغیر عوام کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ باقاعدگی سے دارالعلوم، برطانوی پارلیمنٹ کا ایوان زیریں، میں جایا کرتے تھے جہاں وہ بے پناہ تعریف و

توصیف کے ساتھ اس زمانے کے آرڈنیل (ابرل) رہنماؤں کی تقاریب سنائی کرتے تھے۔ ان میں مسٹر گلیڈسٹون، لارڈ مارل، مسٹر جوزف چیمبرلین، مسٹر بالفور اور عظیم آرٹش محبت وطن مسٹر ٹی پی او کنور وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر تھے۔ دارالعلوم میں اکثر آنے جانے کے باعث وہ پارلیمانی جادو بیانی کے فن سے آشنا ہوئے، جو آنے والے برسوں میں ان کا سب سے مضبوط ہتھیار ثابت ہوا۔

سخت محنت کر کے انہوں نے لکنز ان میں اپنا امتحان دو سال میں پاس کر لیا، اس طرح اٹھارہ برس کی عمر میں یورپ کے ہندوستانی بن گئے، مگر اپنی کیپ اور گاؤں حاصل کرنے کے لئے انہیں مزید کچھ عرصے تک انگلینڈ میں قیام کرنا پڑا، کیونکہ ابھی انہیں قواعد کے مطابق ڈنر (رات کے کھانوں) کی مقررہ تعداد میں شرکت کرنے کی رسم پوری کرنا تھی۔

وہ اس قسم کے طالب علم نہیں تھے جنہیں کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے ہمہ وقت کتابوں پر جھکے رہتا پڑتا ہو۔ نکشیت طالب علم انہوں نے خود کو مختلف سرگرمیوں کے گرداب میں الجھائے رکھا تھا۔ جن میں سے بیشتر کا تعلق انگلستان میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی سرگرمیوں سے تھا۔ لندن میں ان کی آمد کے پہلے ہی برس ہندوستانی طلباء میں بے حد جوش و خروش پایا جا رہا تھا کیونکہ ایک ہندوستانی نژاد پارسی بزرگ دادا بھائی نور و جی کنی برس پہلے کاروبار کے سلسلے میں بھیجی سے آ کر لندن میں آباد ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ سنترل فسبری کے انتخابی حلقات سے برطانوی دارالعلوم کی نشست کیلئے انتخاب لڑ رہے تھے۔ وہ اس قسم کے انتخاب میں حصہ لینے والے پہنچے ہندوستانی تھے، یہ فطری امر تھا کہ لندن میں مقیم ہندوستانی طلباء ان کی انتخابی گہم میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ قائد اعظم نے بھی اس انتخابی گہم میں دل و جان سے حصہ

لیا۔ اس طرح وہ بزرگ ہندوستانی یا ترانی کی نظر میں آگئے۔ اور دادا بھائی نوروجی کے دل میں ان کے لئے احترام اور پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو گئے۔

انتخابی مہم کے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے میرے بھائی نے مجھ سے کہا:

”جب مجھے علم ہوا کہ لارڈ سالبری نے اپنی تقریر کے دوران دادا بھائی نوروجی کو ”کالا آدمی“ قرار دے کر ان کا مذاق اڑایا ہے اور فسیلی کے ووٹوں سے کہا کہ وہ دادا بھائی کے کالے رنگ کے باعث انہیں منتخب نہ کریں تو میں غصے سے کھول اٹھا۔ اگر دادا بھائی کا لے ہیں تو میں ان سے بھی کالا ہوں۔ اگر ہمارے پیٹکل ماسٹرز کی یہی ذہنیت ہے تو ہم ان سے کبھی انصاف اور منصفانہ طرزِ عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس روز سے میں قطعی طور پر ہر قسم کے رنگ کے امتیاز کے خلاف ہوں۔ میں نے انتقاماً اولڈ مین دادا بھائی نوروجی کیلئے کام کیا، خوشنختی سے وہ تین ووٹوں سے جیت گئے۔ اگرچہ دادا بھائی کو بہت ہی معمولی اکثریت سے کامیابی ملی تھی، اس کے باوجود لندن میں مقیم ہندوستانی طلباء کا جوش و خروش نہایت شدید تھا۔ میں نے ہاؤس آف کامنز (دارالعلوم) کی گیلری میں بیٹھ کر اولڈ مین کی سب سے پہلی تقریر سنی تو میں نے اپنے اندر جذبات کی ایک نئی لہر محسوس کی۔“

انہوں نے کہا کہ وہ آزادی تقریر کی ب्रطانوی روایت کے معتبر ہیں اور ب्रطانیہ میں اب ایک ایسا ہندوستانی موجود تھا جو آزادی اظہار کے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کے لئے انصاف کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ وہ بالکل درست کہہ رہے تھے۔ آزادی اظہار کے بغیر کسی قوم کی حالت گلاب کے اس پودے کی سی ہے جو ایسی جگہ اگا ہو جہاں نہ اسے دھوپ ملتی ہو اور نہ ہوا۔

قائد اعظم کے دل میں دادا بھائی نوروجی کا بے حد احترام تھا اور وہ انہیں بہت پسند کرتے

تھے۔ آنے والے برسوں میں ان میں وادا بجائی فروجی تھے ان کی سیاسی انفرادیت پر گھرے اثرات مرتب کئے۔ قائد ہندوستانی نژاد بزرگ سیاست دان سے عمر میں بہت چھوٹے ہونے کے باوجود ان کے ایک مخلص دوست تھے۔ ان دونوں نے مل کر انہیں نیشنل کانگریس کے قیام کے ابتدائی سالوں میں اس تنظیم کے لئے انتہائی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

انگلستان میں ایک طالب علم کی حیثیت سے قیام کے دوران قائد نے محسوس کیا کہ ہندوستانی طلباء کے باہمی رابطے زیادہ قریبی اور عام نہیں ہیں اور اس طرح وہ خود کو موثر انداز میں منظم نہیں کر سکتے۔ اپنی موجودہ حالت میں وہ اپنی یا اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی طلباء ایک ایسوی ایشن قائم کر کے منظم ہو جائیں اور ان کے اجلاسوں کے لئے ایک مقام مخصوص کر کے ان کا ایک باقاعدہ فورم قائم کر لیا جائے تو اس سے خود ان طلباء کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ وہ اس خیال کے باñی تھے اور اس کے تحت انہوں نے متعدد طلباء سے رابطہ بھی قائم کیا مگر سب نے اس بناء پر ان کی مخالفت کی کہ کام بہت بڑا ہے اور ان جیسا کم عمر اور ناجربہ کا ر طالب علم اس کو نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ خیال ان کے ذہن میں بدستور موجود رہا۔ 1913ء میں جب انہوں نے انگلستان کا دورہ کیا تو وہ غیر معروف شخصیت نہیں رہے تھے۔ اب وہ ہندوستان کے ایک ممتاز سیاسی لیڈر تھے۔ چنانچہ ہندوستانی طلباء نے انہیں رہنمائی اور مشورہ حاصل کرنے کے لئے گھیر لیا۔ طلباء نے کیمپنی ہال لندن میں ایک اجلاس منعقد کیا اور قائد کو اس سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے ہندوستانی طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان اور انگلستان میں ہونے والے سیاسی واقعات اور نشوونما کا گہرا مطالعہ رکھیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے طلباء کو خبردار کیا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران عملی سیاست میں بالکل حصہ نہ لیں، کیونکہ ابھی وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، انہیں خالصتاً علمی نقطہ نظر سے موجودہ دور

کے سیاسی واقعات اور معاملات کا پتہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تاکہ جب وہ عملی سیاست کے میدان میں آئیں تو وہ لوگوں کو باخبر رکھنے اور ملکی ترقی کے لئے کوشش رضا کاروں کا کردار ادا کر سکیں۔ انہوں نے اپیل کی طلباء خود کو ایک مربوط ادارے کے اندر منظم کریں۔ چنانچہ اس اپیل کے نتیجے میں انگلی ایشن آف انڈین شوڈنٹس قائم کی گئی۔

ان کے وسیع اور ہمہ گیر مطالعے نے انہیں انگریزی زبان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے روشناس کر دیا تھا۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ تو انہوں نے اپنی آخری عمر تک جاری رکھا۔ ان میں سے شیکسپیر ان کے لئے بے حد لذکشی رکھتا تھا۔ وہ انڈن تھیز کے شوقین تھے، لیکن وہاں اکثر آنے جانے کیلئے ان کے پاس پیے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں تھیز کی دنیا کی جگہ گاتی مگر مہنگی راتوں سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا پڑا تاکہ وہ روپیہ بچا کر کتابیں خریدیں اور صبر و تحمل سے لکنزاں میں ہی اپنے بے کیف مطالعہ کی تیاری کریں۔

مختصر بحث کی وجہ سے انہیں اپنی آمدی بڑھانے کے لئے کوئی ملازمت بھی مل جاتی تو وہ اسے خوش آمدید کرتے۔ بعض اوقات وہ الود و کٹوریہ میں شیکسپیر کے ڈڑائے دیکھنے چلے جاتے۔ جہاں وہ شیکسپیر کیڈراموں میں کام کرنے والے ان ایکٹروں کی کشش سے متاثر ہو جاتے، کچھ عرصہ کے لئے تو وہ سمجھی گی سے سچ پر کام کرنے کے آئیندیا سے جی بہلاتے رہے۔ لیکن انہیں جو واحد پیشکش ہوئی، وہ ایک چھوٹا سا کردار تھا۔ یہ پیشکش ایک غیر اہم تھیز کمپنی کی طرف سے تھی جو کبھی کبھی شیکسپیر کے ڈڑائے سچ کرتی تھی۔ ان دونوں ان کی خواہش تھی کہ وہ اولڈ و کٹوریہ میں رو میو کا کردار کریں۔ لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہوا کا بلکہ یہ خواب زندگی کے وسیع میدان کا رزار میں بھی تھی سمجھیل ہی رہا۔ حتیٰ کہ سرگرم ترین سیاسی زندگی کے ایام میں

جب وہ دل بھر کے کام اور جد و بہدست تکمیل کرنے پر تو وہ شیکسپر کا کوئی ڈرامہ لے کر بستر میں لیٹ جاتے اور آہستہ آہستہ پڑھتے۔ بعض اوقات ڈزر کے بعد جب ہم دونوں ڈرائیور میں بیٹھتے تو وہ شیکسپر کے ڈراموں میں سے اپنے پسندیدہ پیرے بلند آواز میں مجھے سناتے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جب وہ شیکسپر کا کوئی اقتباس پڑھتے تو ان کی آواز کا رنگ درست اور بھر پورا اور اتار چڑھاو موزوں ہو جاتا۔ یہ تو انہی لوگوں کی خصوصیت ہے جنہوں نے سچ ایکننگ کے فن کی ٹریننگ لی ہو۔

زندگی کے ان چار تشكیل پذیر برسوں میں ان کا جوان ذہن غیر محسوس طور پر ایسے اہم فیصلے کرتا رہا جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے تھے۔ قدرت نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا رو باری بننا ان کی غیر معمولی ذہانت سے لگانہیں کھاتا، جہاں زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ہر سال اٹھائی قرضوں اور ذمہ داریوں سے بڑھتے چلے جائیں تاکہ آہستہ آہستہ بہت سی دولت اکٹھی ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو اس کمتر دنیا کی تک گلیوں میں گم نہیں کر دینا چاہتے تھے، بلکہ وہ خود کو برتری اور شہرت کی شاہراہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ سچ کی دنیا کو اپنا لینے کی امنگ کے باوجود انہوں نے اس پیشے کو اپنی بلند پرواز تمناؤں کے مقابلے میں بہت چھوٹی سی خواہش محسوس کرتے ہوئے مسترد کر دیا۔ سچ پر کام کرنے والا اداکار ناظرین کی محدودی تعداد سے داد پاسکتا ہے۔ مگر وہ اس سے بہت بڑے پلیٹ فارم پر لوگوں کے ہیرہوں گے، جہاں وہ اپنے لاکھوں عوام کے مسلمہ لید رہوں گے۔

لکن ان میں ڈنر زکی رسمی کا روایاں مکمل ہو چکی تھیں۔ وہاں تقریباً چار سالہ قیام کے بعد وہ انگلینڈ چھوڑ کر اپنی واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ رائل بنک آف سکاٹ لینڈ کی پاس سک کے اندر وہی کور میں ان آخری چار چیزوں کا اندر راج ملتا ہے جو انہوں نے لندن سے روائی سے

قبل مختلف لوگوں کو دیئے تھے۔ انہوں نے پہلا پیک 14 جولائی 1896ء کو مسز ایف ای چیچ ڈریک کو دیا تھا۔ اس کی مالیت تین پونڈ تھی، اور یہ شاید اس خاتون کو معاوضہ پرکھبرانے والے مہمان کی حیثیت سے باقی ماندہ واجبات کی ادائیگی اور حساب ختم کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ 15 جولائی کو انہوں نے تین چیک کاٹے، ایک کی مالیت 10-1-71 پونڈ تھی اور یہ چیک انہوں نے نیشنل بنسک آف انڈیا یونیورسٹی کے نام لکھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وطن واپسی سے قبل لندن میں ہی کراچی کی بجائے بمبئی میں مقیم ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے، دوسرا چیک انہوں نے لندن سے کراچی تک بھری جہاز سے واپسی سفر کے کرائے کی ادائیگی کے لئے تحریر کیا۔ اس کی مالیت 12-18-42 پونڈ تھی، لندن میں تقریباً ساڑھے تین برس قیام کے دوران ان کے بنسک کے کھاتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں مجموعی طور پر تقریباً آٹھ سو پونڈ کی رقم جمع کرائی گئی تھی۔ چونکہ وہ ہمیشہ اپنا کیش بنسک میں جمع کرانے کے عادی تھے۔ اس لئے بے خوف و خطر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ قریب قریب وہی رقم ہے جو انہوں نے انگلینڈ میں خرچ کی۔ اس سے ان کے سادہ طرز زندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جسے کار و باری حالات میں تبدیلی کے باعث گھر سے واپسی کی فراہمی ممکن نہ رہی تھی، اور روپے کے معاملے میں محتاط ہونا پڑا۔

گھر واپسی کے لئے انہیں ایک بار پھر اسی قسم کے بھری جہاز سے سفر کرنا پڑا جو تین چھتے میں ہندوستان پہنچا کرتے تھے۔ ان کا مستقبل اتنا ہی پوشیدہ تھا جتنا کہ گھر اسمندر۔ وہ صرف ایک وسیع خاندان کے ان اندیشوں اور پریشانیوں سے باخبر تھے جو ان کے والد کے ناتوان کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ جنہیں امید تھی کہ ان کا بڑا بیٹا جلد ہی یہ ذمہ داری کسی حد تک خود سنبھال لے گا۔ اس کی گھر واپسی ان کے لئے بے حد جذبائی بات تھی۔ کیونکہ جو نبی اس کا جہاز سبک رفتار

سے لنگر انداز ہو رہا ہو گا اور اس کی تلاش میں کراچی بھر کا گی کو دی پر منتظر ہجوم پر پڑیں گی۔ تو وہ اپنے والد، بھائیوں، بہنوں اور چند ایک رشتے داروں کو تودیکھ سکے گا، لیکن اسے اپنی ماں وہاں نظر نہیں آئے گی۔ تقدیر اس کے ساتھ کس قدر بے رحم رہی۔ اب جب وہ ایک تابناک مستقبل کے ساتھ بیر شر بن کر انگلینڈ سے واپس آ رہے تھے۔ اگر ان کی والدہ وہاں ہوتیں تو وہ اپنے محمد علی پر کس قدر فخر کرتیں۔

گھر پہنچنے کے فوراً بعد میرے والد نے ان کے ساتھ صلاح و مشورہ شروع کر دیا، والد نے محمد علی کو بتایا کہ ان کا خاندانی کارو برتاہ ہو چکا ہے اور یہ کہ بہت سے کارو باری اداروں کو بڑی بڑی رقم ابھی تک ان کے ذمہ واجب الادا ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنی رقم کی واپسی کے لئے ان پر عدالتوں میں مقدمے بھی دائر کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال ان کارو باری سودوں کی بھی تھی جو میرے والد نے محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے نام سے اس امید پر کئے تھے کہ ان کا بیٹا انگلستان سے واپسی پر خاندانی کارو بار کے علاوہ اس فرم کو بھی سنبھال لے گا۔

یہ اس کا اپنا کارو بار ہو گا جو پہلے ہی سے مستحکم اور منافع بخش بنیادوں پر استوار ہو چکا ہو گا، مگر یہ کارو بار بھی فلاپ ہو چکا تھا اور متعدد مقدمات محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے خلاف زیر سماعت تھے۔ محمد علی ایک نوجوان بیر شر تھے اور ان کے سامنے خود اپنے خلاف اس قسم کے کمزور مقدمات کے دفاع کا مسئلہ ان کھڑا ہوا تھا۔ والد نے کہا کہ میرے بیٹے میرے تمام خواب لوث کر بکھر چکے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ تم پر اور تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں پر کیا بیتے گی۔ میری صحت پہلے ہی بہت خراب ہو چکی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کب تک زندہ رہوں گا۔“

محمد علی نے لڑکھڑا تی ہوئی آواز میں جواب دیا: ”ابا جان! آپ فکر نہ کیجئے، میں سخت محنت

کروں گا اور آپ کا اور اپنے کتبے کا خیال کوں گا، میں جوان ہوں اور میری ساری زندگی پڑی ہے، میں روپیہ کماؤں گا اور اپنے خاندان پر واجب الادا تمام قرضے اور رقم ادا کروں گا۔“

میرے والد نے سوچا کہ محمد علی کو کراچی کے کسی کامیاب وکیل کے دفتر میں جو نیز کی حیثیت سے لگا دینا مناسب رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے دو فرموں میں بات بھی کر لی، جو مختلف مقدمات میں ان کی فرموں کی وکالت بھی کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہر چند رائے وش داس اینڈ کمپنی تھی اور دوسری کا نام لال چندا اینڈ کمپنی تھا۔ دونوں قانونی فرموں کے سربراہ حال ہی میں انگلستان سے واپس آنے والے اس نوجوان مسلمان بیرسٹر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ ان دونوں مسلم اکثریتی صوبہ سندھ میں چندا ایک ہی مسلمان بیرسٹر تھے۔ دونوں فرموں کے سربراہوں کو یقین تھا کہ محمد علی ان کے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہوں گے، مگر میرے بھائی اس بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ کراچی میں پریکٹس کرنے کی بجائے جہاں ان کے خاندان کی کاروبار میں ناکامی کی تلخ پر چھائیں ان کا راستہ مزید المجھا سکتی تھیں۔ وہ بسمیلی میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں بسمیلی ایک ایسا شہر تھا جہاں سخت محنت کرنے والوں کے لئے آگے بڑھنے کے بہت سے اچھے مواقع موجود تھے۔ میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا کراچی میں ہی پریکٹس کرے جہاں ان کا خاندان بہت سے لوگوں اور گھر انوں کے ساتھ دوستیاں اور تعلقات استوار کر چکا تھا۔ کراچی سے اپنا تعلق یکسر ختم کر کے بسمیلی میں نئے سرے سے زندگی کے سفر کا آغاز کرنے میں انہیں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست اور پڑوی مسٹر رام جی بھائی پیٹھا بھائی سے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ان کے بیٹے کو کراچی میں پریکٹس کرنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش کریں۔ رام جی بھائی کی تمام تر کوششوں کے باوجود نوجوان بیرسٹر اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ وہ اپنا

فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے ہی راستے پر پہنچا پہنچا۔ ہب تولی وہ زندگی میں رکا و ٹوں اور سخت مشکلات کا کٹھن راستہ اپنانا چاہتا تھا۔

اس وقت انہیں اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ بسمی میں آباد ہونے کا فیصلہ ان کی زندگی کا انتہائی اہم سنگ میل ثابت ہو گا اور ان کے مستقبل پر ان کے نہایت گھرے اثرات مرتب ہونگے۔ چنانچہ اپنے والد اور بھائی بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر وہ بھری جہاز سے بسمی چلے گئے۔

انہوں نے طویل المعاوِد کرائے کی بنیاد پر بسمی کے اپا لو ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور پریکٹس کرنے کے لئے اپنا نام بسمی ہائی کورٹ میں درج کروالیا۔ یہ محض رسمی کارروائی تھی، اسلئے بآسانی مکمل کر لی گئی۔ اصل مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے لئے ایک دفتر بنائیں، مقدمات حاصل کریں اور ایک قابل اعتماد بیرسٹر کی حیثیت سے شہرت کمائیں۔ انہوں نے تمام تر توجہ اس جانب مبذول کر دی۔ یہ نوجوان باوقار انداز کے ساتھ کئی عدالتوں کے برآمدوں میں اکثر آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے صفحہ اول کے کسی بیرسٹر کا تاثر نہ ملتا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے پہلے مقدمے کی بے تحاشا ضرورت تھی۔ وہ اپنے قائم کردہ تصورات کی دنیا میں بھی منفرد و یکتا نظر آتا تھا۔ جب کہ اسی پیشے میں اس سے کمتر صلاحیتوں کے حامل وکیلوں کے دفتروں میں ایسے موکلین اکثر آتے رہتے تھے، جو منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ فورٹ علاقے میں ایک کمرے پر مشتمل کرائے کے چھوٹے سے دفتر میں کسی موکل کی آمد کے انتظار میں اپنے پاس موجود قانون کی کتابوں کے محمد و دشائک کے مطالعے میں غرق رہتے۔

بسمی ہائی کورٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانے کے بعد کسی مقدس مذہبی فریضے کی طرح روزانہ عدالتوں کے چکر لگانا اور مہینوں ایک روپیہ کا نے بغیر شام کو اپا لو ہوٹل

کے مدد و دکرے میں واپس آ جانا، ان کیلئے بہت سی خوشنگوار تحریر ہے تھا، لیکن جب تکلیف وہ مبینے تین کریناک سالوں پر دراز ہو گئے۔ تو وہ فی الواقع شکستہ حال ہو گئے۔ اس وقت کراچی میں ان کے والد اور خاندان کو مقدمات اور مشکلات کا سامنا تھا، مگر وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے، یہ صورت حال ان کی توقعات کے قطعی برعکس تھی، جوانہوں نے کراچی سے بمبئی روانہ ہونے سے پہلے قائم کی تھیں۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں میں بھی انہوں نے اپنے ٹھاٹھ برقرار رکھے لیکن وہ دل میں اپنی خواہش پوری نہ ہونے کا درد محسوس کرتے تھے۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود کہ جن سے وہ گذر رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے سماجی روابط برقرار رکھے۔ وہ بمبئی کی بہترین کلبوں میں آتے جاتے رہے اور انہیں بمبئی کے معزز زین شہر کے گھروں میں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں بھی بلا یا جاتا رہا، اپنی عمر کی تیسرا دہائی کے شروع میں ایک انتہائی پرکشش نوجوان تھے۔ وہ دبليے پتلے اور چھا جانے والی شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھیں چھوٹی مگر گہرائی تک اتر جانے والی تھیں، جن سے ذہانت پنکتی تھی۔ چہرہ نمایاں یونانی خدوخال لئے ہوئے تھا۔ ہاتھ پاؤں لمبے تھے۔ وہ انتہائی نیس لباپہنا کرتے تھے۔ ان کے مجموعی سراپے سے واضح طور پر یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ پیدائش طور پر اپنے ہم جنس انسانوں کے رہنمات تھے۔ قدرت نے انہیں دلکش اور باوقار شخصیت عطا کی تھی مگر معاشرے نے انہیں پر سکون اور خوشنگوار زندگی بسرا کرنے کے لئے وسائل فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جدوجہد کے ان دنوں میں جن لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا تھا، وہ انہیں عزم اور حوصلے سے بھر پور نوجوان قرار دیا کرتے تھے، مگر وہ لوگ شاید نہیں جانتے تھے کہ اس بھر پور نوجوان کی جیسیں کس حد تک خالی تھی۔

لیکن غیر ارادی طور پر یہ سماجی تعلقات ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئے اور کامیابی کا

باعث بنے، انکے ایک قریبی دوست نے جوان کی وہی وبلد حوصلگی کا بے حد معترف تھا۔  
انہیں مسٹر میکفرسن سے متعارف کرایا جو اس وقت بہبیتی کے قائم مقام ایڈ ووکیٹ جزل تھے۔

مسٹر میکفرسن اس نو جوان بیرٹر سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے اپنے ماتحت کام کرنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے محمد علی کو اپنی خصیم لاہری ی سے استفادہ کرنے اور اپنے چیمپریز میں مطالعہ کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ میرے بھائی نے مسٹر میکفرسن کی طرف سے اس بلند جذبے کو ہمیشہ یاد رکھا۔ بالخصوص جیسا کہ اس زمانے میں ایک انگریز کی طرف سے ہندوستانی بیرٹریوں کے ساتھ تو اضع کا ایسا اظہار شاذ ہی ہوتا تھا۔

میسٹر میکفرسن نے جل دہی محسوس کر لیا کہ ان کے دفتر میں آنے والا نیا نو جوان بیرٹر پر کشش شخصیت، قابلیت، مستقل مزاجی اور دیانت داری کے اوصاف کا مالک ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض مقدمات نو جوان مسٹر جناح کو بھگوانا شروع کر دیئے۔ اس موقع پر میرے بھائی کے دل میں سرکاری ملازمت کرنے کا خیال پیدا ہوا تاکہ انہیں معقول حد تک مسلسل مالی تحفظ کا اطمینان ہو۔

بار میں کامیابی کی بے یقینی اتنی مہیب تھی کہ اس کا تصور ہی مشکل تھا۔ جب انہوں نے اپنا یہ خیال مسٹر میکفرسن کے سامنے رکھا تو انہوں نے زبردست تائید کرتے ہوئے انہیں ملکہ انصاف کے رکن سرچارلس آر لیونٹ کے پاس بھجوادیا۔ اور دو ہفتوں کے اندر میرے بھائی کا عارضی پر یہ یہ نیشی کی حیثیت سے تقریب ہو گیا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ اب تک جو کامیابی ان سے دور رہی تھی، اب مکمل طور پر ان کے ہاتھ آچکی تھی، مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کے مثالی روئے نے ان کے سنیئر زکوان کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب ان کے عارضی تقریر کی معیاد ختم ہو گئی تو سرچارلس آر لیونٹ نے ایک

دوسری مگر بہتر عدالتی نوکری کی بیکش کی۔ جس کی ماہوا تنخواہ پرور پہنچی، اور اس زمانے میں بہت بڑی تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ انہوں (قائد اعظم) نے جواب دیا: ”نبیس، شکریہ جناب۔ میں جلد ہی اتنی رقم ایک دن میں کمانے لگوں گا۔“ یہ ان کا دندان شکن جواب تھا۔

جب انہوں نے بسمی پر یہ یہ بیسی کے قائم مقام محضیت کے عہدے سے استعفی دیا تو بہت سے لوگ انہیں اپنا وکیل بنانے کے لئے ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپالو ہوٹل میں اپنا مختصر سا کمرہ چھوڑ کو اپالو بندر کے علاقے میں ایک مناسب فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اس کی ترکین و آرائش انتہائی نفاست اور باذوق انداز میں کرائی اروائیک بلڈنگ میں اپنا نیا دفتر قائم کیا جس میں بعض دوسرے وکلاء کے دفاتر بھی تھے۔ انہیں اپنے دفتر کو باوقار اور پرکشش انداز کا چیمبر بنانے کے لئے اپنی محدود دارالفنون میں سے کوئی پیسہ نہ پختا۔ جس چیمبر کا مالک بننے پر کوئی بھی وکیل فخر کر سکتا ہے۔ کامیابی کی سیر ہی پران کے قدم مضبوطی سے جم چکے تھے، اب انہوں نے میرے والد کو کئی خط لکھے اور تاریخیجے کہ اب وہ پورے خاندان کے ساتھ ان کے پاس بسمی چلے آئیں۔

میرے والد اپنی شریک حیات کو کراچی میں کھو چکے تھے۔ وہ بڑا کاروبار جو انہوں نے اپنے بیٹے کو منتقل کرنے کی نیت سے انتہائی محنت اور جدوجہد کے نتیجے میں کھڑا کیا تھا، برپا و ہو چکا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب کراچی میں مزید قیام سے صرف ان کے ذہن میں تلخ یادیں تازہ ہوتی رہیں گی۔ مزید برآں اب جبکہ ان کا بیٹا بسمی میں اپنے پاؤں پر آسودگی کے ساتھ کھڑا ہو رہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے اور ان کے خاندان کے لئے بسمی چلے جانا ہی بہتر ہے گا۔ یوں ہم بسمی چلے آئے، اور کھڈک میں واقع خوجہ محلے میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ میرے بھائی ہم سے ملنے کے لئے اکثر دہاں

آتے رہتے تھے۔ اب وہ اپنے پیشی میں کافی روپیہ کارہے تھے جس کے ذریعے وہ آسودہ زندگی بس کر رہے تھے اور اپنے خاندان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے، اپنے تمام بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات وہی برداشت کرتے تھے۔

انہتائی مشکل اور حوصلہ شکن جدوجہد نے ان کی خود اعتماد کی چمک کو مانند نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مکمل آزادی کی زندگی گزارنے پر ان کا اعتماد متزلزل ہوا تھا۔ اپنے سے بالاتر لوگوں کی سرپرستی اور سینئر ز کی جانب سے ڈرانے دھمکانے یا ستائے جانے کے جواب میں ان کا رویہ پدستور جھک جانے یا شکست تسلیم کر لینے کے قطعی برعکس تھا۔ اسی وجہ سے سرچمن لال سیتلواڈ نے لکھا：“ جناح نے ہمیشہ حتیٰ کہ اپنے جو نیٹ ہونے کے دنوں میں بھی بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کبھی فریق مخالف کے وکیل یا جج کو خود پر غائب نہیں ہونے دیا۔”

لوگ اکثر اوقات میرے والد کو بتایا کرتے تھے کہ ان کا بیٹا اپنی حد سے بڑھتا جا رہا ہے اور یہ کہ اس کا ظاہری گھمنڈ اپنے سینئر ز کے ساتھ بار روم اور عدالت کے رو برو تیز مزاجی ان کے عروج ارتقی می را ہیں مسدود کر کے رکھ دے گی، مگر محمد علی کے بارے میں ابتداء میں پائے جانے والے شکوک و شبہات ختم ہو چکے تھے۔ اور میرے والد کے ذہن میں یہ اعتماد بڑھتا گیا کہ ایک شاندار مستقبل ان کے بڑے بیٹے کا منتظر تھا۔

مسٹر سٹرینگ میں بھائی بار کے ایک سینئر اور قابل احترام انگریز رکن تھے۔ ان دونوں (محمد علی جناح اور سٹرینگ میں) کو ایک مقدمے کے سلسلے میں مشترک طور پر وکیل مقرر کیا گیا۔ ایک موقع پر میرے بھائی کو سٹرینگ میں کے چیمبر میں اس کیس پر مشترکہ صلاح مشورے کے لئے جانا پڑا۔ اس زمانے میں انگریزوں کو اپنے ہندوستانی رفقاء کا رکن کے ساتھ تحکمانہ انداز روکھنا عامی بات تھی۔ سٹرینگ میں نے قائد کے ساتھ بات چیت میں ایسا لب والجہ اور رویہ اختیار کیا

جو میرے بھائی کے نزدیک تو ہیں آئیں اور قہارت پہنچتی۔ اس روز کی بعد وہ دوبارہ کبھی سٹرینگ میں کے چیمبر میں نہیں گئے۔ حتیٰ کہ عدالت کے اندر اور باہر جب کبھی سٹرینگ میں ان کے سامنے آیا تو اس کے ساتھ رسمی علیک سلیک بھی نہیں کرتے۔

بمبئی میں ایک نوجوان وکیل کی حیثیت سے وہ ایک مرتبہ جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش ہو رہے تھے۔ ان کے مخالف وکیل سرچمن لال سیتلواڑا تھے۔ جب قائد دلائل دے رہے تھے، تو جسٹس مرزا نے انہیں ٹوکا اور سرزنش کی۔ قائد نے اس کا برا منایا اور اس کے بعد انہوں نے نج کو ایسے انداز میں مخاطب کرنا شروع کر دیا جسے جسٹس مرزا نے تو ہیں محسوس کیا۔ نج نے نوجوان پیر سڑکو تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ”آپ کے الفاظ اور لہجہ تو ہیں عدالت کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ تو پھر نج نے سیتلواڑا سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا: ”میر سیتلواڑا کیا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے۔“؟ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سرچمن لال سیتلواڑا نے اپنی کتاب میں لکھا:

”نج کا مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا انتہائی احتمانہ تھا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا: ”یہ رائے دینا میرا کام نہیں ہے کہ مسٹر جناح نے تو ہیں عدالت کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں، یا آپ کا حق ہے کہ آپ اس بات کا تعین کریں۔ مگر میں مسٹر جناح کے ایک جانے والے کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا مقصد عدالت کی تو ہیں کرنا کبھی نہیں ہو سکتا۔“

بعد کے برسوں کے دوران اس واقعہ کا یاد کرتے ہوئے قائد نے بتایا: ”اس روز کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں نج کیتھی وکیل جسٹس مرزا کی عدالت میں کبھی پیش نہیں ہوں گا۔“

## قوم پیغمبر ہو گئی

جب میں کراچی میں اس مزار کی دیواروں کو ایک ایک انج بلند ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں جو میرے بھائی کے جسدِ خاکی کو محفوظ کر دینے کے لئے کھڑی کی جا رہی ہیں تو میرے ذہن میں اس المناک دن کی یادیں آ جاتی ہیں، جب 11 ستمبر 1948ء کو ہفتہ کے دن میرا بھائی مجھ سے چھن گیا تھا اور میری قوم پیغمبر ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ میری رفاقت چالیس برس سے بھی زائد عرصے پر محيط رہی تھی۔ اس طویل عرصے کے دوران میں نے ان کی زندگی کو کس طرح دیکھا تھا۔ اس کام کا آغاز کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ میں آج صحیح ان کی قبر پر حاضر ہوں۔ ان کے لئے فاتحہ خوانی کروں۔ انہیں پھولوں کا نذرانہ پیش کروں اور ان کے لئے آنسو بھاؤں۔ کیونکہ آدمی جن سے محبت کرتا ہے، جب وہ پچھڑ کر دوسرے جہان میں چلے جائیں تو کوئی انہیں ان چیزوں کے سوا بھلا کیا دے سکتا ہے۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، یہ کتاب ان کی زندگی اور کارناموں، ان کی برسوں کی جدوجہد، رکاوٹوں کے ایام اور کامیابی کے لمحات اور اس

جبکہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاویں کے باوجود انہوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا۔ وہ آرام کرنے اور اپنے کام میں کمی کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ وہ زندگی کی توانائی کے باقی ماندہ ذخیرے کو کسی کھلنڈرے پچ کی طرح بے دریغ لٹاتے رہے۔ ان کی خرابی صحت سے خوفزدہ ہو کر میں جب کبھی ان سے طویل اوقات میں اتنا زیادہ کام نہ کرنے کی التجاکرتی یا ہندوستان بھر کے مسلسل طویلی دوروں کا پروگرام کچھ عرصے کے لئے ملتی کر دینے کا مشورہ دیتی تو وہ کہتے: ”کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جزل نے چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو؟“ انہیں کمال حاصل تھا کہ بنا بنا یا مقدمہ ایک جملے میں اڑا دیتے۔ میری بھلا کیا حیثیت کہ انہیں قاتل کر سکتی۔ ایسے موقع پر میں عموماً دلائل کی بجائے

www.freepdfpost.blogspot.com

جدبات کا سہارا لیا کرتی تھی۔ میں کہتی ہے اور آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہئے۔“ ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے۔ وہ کہتے: ”فرد واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے، جبکہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقا کے بارے میں پریشان ہوں، کیا تم جانتی ہو کہ مسلمان قوم کتنے خطرے میں ہے؟“ ان کا یہ کہنا جدبات کو خاموش کر دینے کے لئے کافی ہوتا۔ اور اس کے بعد وہ اپنی صحت کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے سیاست کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے۔

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت فروری 1937ء میں عام انتخابات کر دائے جائے تھے، جن میں آل انڈیا مسلم لیگ پہلی مرتبہ اپنے امیدوار کھڑے کر رہی تھی۔ اس مرٹلے پر لیگ نہ تو پوری طرح منظم تھی اور نہ ہی اس کا پیغام ابھی مسلمانوں تک پوری طرح پہنچایا جا سکا تھا۔ چنانچہ رائے عامہ کو لیگ کے حق میں استوار اور منظم کرنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی۔ عوام کے اجتماعات اور جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے وہ جس قدر زیادہ سفر کرتے، اسی قدر ان سے مزید جلسوں کے لئے وقت مانگا جاتا۔ ملک بھر کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہات سے انہیں وہاں کے دورے کرنے کی بے پناہ دعوییں موصول ہوتیں، تاکہ لیگ کا پیغام مسلمانوں تک پہنچایا جاسکے۔ مسلمانوں میں یہ شعور بتدریج پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ جب تک وہ متعدد نہیں ہوں گے، ان کا سیاسی مستقبل محفوظ نہیں ہو سکے گا۔

وہ جہاں بھی گئے، میں ان کے ہمراہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں کا خواب غفلت سے بیدار ہونا انتہائی حوصلہ کا باعث تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جلسوں میں شریک ہونے والے لوگوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر نہ صرف مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے، بلکہ محمد علی جناح کی ذاتی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جب

وہ یہ کہتے کہ مسلمان ایک بڑی وقت میں مستقبل میں نافذ کی جانے والی سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں جو مستقبل میں نافذ کی جانے والی سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ متحده ہو جائیں تو اس پر فضا پر جوش نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھتی۔ وہ ایک پر جوش رہنمای کی طرح بلند آواز میں کہتے: ”سب کو جان لینا چاہئے کہ مسلم لیگ قائم رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو درہم برہم کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوں گی۔ مسلمان اپنی منزل کی جانب آگے بڑھ رہے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو کامیاب ہونے سے نہیں روک سکتی۔“ اس قسم کے امید افزاء الفاظ کے ساتھ جب وہ اپنی تقریب ختم کرتے تو ہجوم بے اختیار نظرے لگانے لگتا۔ ”مسلم لیگ زندہ باد۔ محمد علی جناح زندہ باد۔“

1940ء میں جب سے مسلم لیگ نے لاہور میں اپنی قرارداد منظور کی تھی جو قرارداد پاکستان کے نام سے معروف ہوئی، تب سے کام کی زیادتی کے باعث وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کا بھی خیال نہ رکھتے۔ ان کی واحد قوت ان کے منشر اور غیر منظم پیروکار تھے۔ انہوں نے اس برس (1940) سے انسانی تاریخ کے ایک عظیم باب کی حیثیت سے قیام پاکستان کے مطالبے کو عملی شکل دینے کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک سیاستدان کو اپنی جدوجہد کے دوران بے پناہ سفر کرنا پڑتا ہے، طویل اور تکلیف دہ حالات میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور یہ امور ان کی صحت پر بہت گراں تھے۔ مگر انہوں نے ان سب مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ پانچ فٹ ساڑے دس اچھے قد کے ساتھ ان کا معمول کا وزن 112 پونڈ تھا۔ مگر اب ایک ایک اونس کر کے ان کا وزن کم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی صحت اور اسی قسم کے دیگر ذاتی معاملات سے قطعی بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کے نجی معاملات ان کے کام میں حائل ہوں۔ میں نے ایک

بار پھر انہیں دلائل سے، اور انجام کرنے کے لئے کل کوشش کی کہ وہ قابل ارادوں کے آگے بند باندھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جو ان تمام رکاوٹوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے جو ان کی قوم کی راہ میں حائل تھیں۔

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے کے علاوہ انہیں مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی لیڈر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ گذشتہ کئی روز سے انہیں بخار ہو رہا تھا، اس کے باوجود ہم نومبر 1940 میں اسیبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے بھی سے دہلی روانہ ہوئے۔ وہ رات کا کھانا کھا کچکے تھے اور ٹرین تاروں بھرے صاف شفاف آسمان کے نیچے تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ تھی۔ وہ بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک زور سے چلا اٹھے۔ جیسے کسی نے لوہے کے سرخ دیکھتے ہوئے نکل دے سے ان کا جسم داغ دیا ہو۔ میں جلدی سے ان کے پاس پہنچی اور ان کے اس طرح بلبلہ اٹھنے کی وجہ دریافت کی۔ درد کی شدت نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ چنانچہ کچھ کہنے کی بجائے وہ انگلی سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے دائیں جانب صرف اشارہ کر کے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ دردنا قابل برداشت تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ چلتی ہوئی گاڑی میں طبی امداد انہیں مل سکتی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے خیال سے ان کے جسم کے متاثرہ حصے کو آہستہ آہستہ سہلانا شروع کر دیا۔ مگر ایسا کرنے سے ان کی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ مجھے امید تھی کہ ٹرین کسی سٹیشن پر رکے گی تو متاثرہ حصے کی نکور کرنے کے لئے گرم پانی کی بوتل مل جائے گی۔ وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹرین کے بریکوں کی چرچراہت سنائی دینے لگی اور بالآخر گاڑی ایک سٹیشن پر رک گئی۔ میں نے گارڈ سے کہا کہ وہ فوراً گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کرے اور اسے ہمارے کمپارٹمنٹ

میں بھجوادے۔ یوں آگئی تو میں نے ایک نیک پیپر کر دیا جسکے پر آہستہ آہستہ تکوں کرنا شروع کی اور یہ جان کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس سے درد کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔  
ٹرین علی الصبح دبلي پہنچی اور جلدی ہی ہم اپنی رہائشگاہ 10 اور نگزیب روڈ پہنچ گئے۔ میں نے اپنے بھائی کو کار سے بستر تک لے جانے میں ان کی مدد کی۔ اور میں نے ٹیلی فون پر ڈاکٹر کو بلا یا، تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ قائد اعظم کے پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آگیا ہے اور انہیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی طور پر آرام کرنا چاہئے۔ جو نبی ڈاکٹر گیا میرے بھائی نے مجھ سے کہا: ”کس قدر بد قسمتی کی بات ہے، یہ اجلاس بہت اہم ہے، میری وہاں موجودگی نہایت ضروری ہے اور ایک میں ہوں کہ بستر میں جبڑی آرام کی عیاشی کا پابند کر دیا گیا ہوں۔“ وہ صرف دو روز تک بستر میں رہے، اس کے بعد دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک مختلف اور بے چین شخص تھے جو اپنی قوم کی تاریخ کے پریشان دور میں پیدا ہوئے تھے۔

یہ سنٹرل اسٹبلی کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ اور جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے ضمن میں مسلم لیگ کا موقف بیان کرنے کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ جب میں نے معزز مہماںوں کی گیلری میں سے انہیں ایوان میں اپنی نشست سے خطاب کرنے کے لئے انھوں کو ہوتے ہوئے دیکھا تو میں حیران ہو رہی تھی کہ کیا واقعی وہ اپنی تمام تر توانائیاں جمع کر لینے کے باوجود چند منٹ سے زیادہ تقریر کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ایسے لبھے اور انداز سے کیا جس سے تھکن نظر آ رہی تھی۔ مگر جب انہوں نے اپنے دلائل کا آغاز کیا تو تھکاوث کے تمام آثار یا کا یک غائب ہو گئے۔ وہ جلد ہی اپنے اصل رنگ میں آگئے اور انہوں نے مسلمانوں کو بہلانے کے لئے حکومت کی جانب سے کئے جانے والے پر اپیگنڈا کامڈاں اڑانا شروع کر دیا۔ حکومت کو تقدیم کا نشانہ بناتے ہوئے انہوں نے کہا: ”یقیناً آپ بہت پر اپیگنڈا کر سکتے ہیں، مگر

بعض ایسی چیزیں ہیں جنہیں آپ مجھ سے فوٹو ہر اس پر یہاں کیلئے مل نہیں کر سکتے۔“ <http://libraryfurdubooks.blogspot.com/>

انہوں نے تقریر یہ جاری رکھتے ہوئے کہا: ”کمزور فریق کو یہ پھر دینا فیشن بن چکا ہے، اور آپ کمزور فریق کو یہ پھر دینے کی پوزیشن میں ہیں..... مگر ہم یقیناً ایسے اخراجات کی فراہمی کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے جو ہم مہیا نہیں کر سکتے جن میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہو یا جن پر ہمارا کنشروں نہ ہو۔“

انہوں نے گرم جوشی سے تقریر یہ جاری رکھتے ہوئے کہا: ”اگر کانگریس گورنمنٹ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی تو اس میں میرا کیا قصور۔ قصور تو آپ کے آئین کا ہو گا۔ یہ آئین تم نے تیار کیا اور تم بے چک اور دیاناوسی حکومت کئی دہائیوں سے اس پر عمل کئے جا رہی ہو، اور تم اسے دونوں طریقوں سے نہیں اپنا سکتے۔ یہ ہے تمہارا آئین جو تم نے خود ہی بنایا ہے۔“

میں اس ایوان میں بر ملا کہتا ہوں کہ آج تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ طے نہ پانے کی وجہ (کانگریسی رہنماؤں سے معدودت کے ساتھ) یہ رہی ہے کہ کانگریس خالصتاً ایک ہندو تنظیم ہے خواہ ان کا بیان کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ کہ ہندو اور کانگریسی لیڈرؤں کے دماغ کے آخری گوشے میں ہمیشہ یہ بات موجود رہی ہے کہ مسلمانوں کو بالآخر کانگریس کے دام اور ہندوراج کے تسلط میں آنا ہی پڑے گا اور یہ کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور اقلیت کے لئے وہ صرف تخفیفات ہی کا مطالبہ کر سکتے ہیں، مگر میں کانگریسی حضرات اور کانگریس پارٹی کے نیشنل ارکان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس ہمیشہ اس بات کے ٹھوں دلائل اور موجود رہے ہیں۔ اور اس بات میں گذشتہ پچیس برس کے دوران کوئی تبدیلی نہیں آئی..... کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔“

اس پر مسٹر ایم ایس اینے نے انہیں زیچ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”کم از کم

1920ء سے پہلے تو مسٹر جنائیک کی ایات یہ نہیں تھے؟ ”قائد اعظم“ نے جواب دیا：“1916ء میں لکھنو پیکٹ دوالگ الگ قوموں کے اصول کی بنیاد پر منظور کیا گیا تھا۔“

مسٹر اینے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے غصے سے چلا کر کہا: ”میں وہاں موجود تھا۔“ ”قائد اعظم“ یہ سن کر پر سکون انداز میں کھڑے رہے اور پھر انہوں نے نہایت نرمی سے فرمایا: ”ہو سکتا ہے میرے دوست اس وقت وہاں موجود ہوں مگر تب کسی نے ان کا نام تک نہیں سنا تھا۔“ اس سخت جملے نے عام حالات میں کبھی نہ دبنے والے مسٹر اینے کو خاموش کر دیا۔ قائد اعظم تقریباً ایک گھنٹہ بولے اور وہ بدستور کھڑے تھے۔ جبکہ میں ان کی صحت کے بارے میں تشویش میں بتلا تھی جو ہرگز اطمینان بخش نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر دی۔

”بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی تقریر میں صرف دو چیزوں پر زور دیا ہے، جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت اور قومی حکومت کا قیام۔ مگر اس کا فائدہ؟ یہ کا بینہ خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، یہ قانون ساز اسٹبلی کے سامنے جواب دہ ہوگی جس میں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی منتخب ارکان کی دو تھائی اکثریت کی قیادت حاصل کر سکتے ہیں۔ جذبہ ترجم اس شخص کے ساتھ ہو گا جو کا بینہ میں موجود ہونے کے باوجود کا انگریس کی قیادت اور اسکی ہدایات سے آزاد رہے گا۔“

جب ہم اسٹبلی سے بذریعہ کا رگر کی جانب جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کا انپ رہے تھے اور ان کی انگلیاں سگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے تھیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے جا کر بستر میں لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ ان میں لباس تبدیل کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

میرے خیال میں پھیپھڑے کی جھلی پرورم کا جملہ ہی بالآخر آگے چل کر ان کی موت کا سبب ہنا، وہ اس مرض پر قابو پا سکتے تھے بشرطیکہ وہ احتیاطی تداہیر اختیار کرتے۔ اگر انکے کام کرنے

کے اوقات معین اور منتظم ہو جاتے۔ گروہ آدمیوں اور بارٹوں میں باہر نکلنے میں احتیاط کرتے مگر وہ برصغیر کے تقریباً مسلسل دورے پر رہا کرتے تھے۔ اس مرض کے بعد وہ سردی سے ارجک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ سردی کے معمولی سے جملے سے بھی وہ کئی کئی روز بخار اور کھانسی کی اذیت میں بٹلار ہتے تھے۔

چند ماہ بعد اپریل 1941ء میں ہم بھی سے مدراس جا رہے تھے جہاں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانہ میں گئے۔ یہ دیکھ کر صدمے سے میرا براحال ہو گیا کہ وہ چند قدم چلنے کے بعد ٹرین کے چوبی فرش پر نہ حال ہو کر گئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا: ”جن کیا بات ہے؟“ ایک روکھی پھیکی اور تھنکی ہوئی مسکرا ہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی، ”میں بیحد کمزوری اور تھکاؤٹ محسوس کر رہا ہوں۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر خود کو اٹھایا اور اڑکھڑاتے ہوئے اپنی بر تھکی جانب بڑھے۔ خوش قسمتی سے ٹرین چند ہی منٹ کے دوران کسی اہم جگنشن پر پہنچ کر رک گئی، جہاں ہزاروں جو شیلے مسلم لیگی کا رکن ”قائد اعظم زندہ باد“ کے نفرے لگا رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے کپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور چلا کر کہا: ”شورمت مچائیے، قائد اعظم تھکاؤٹ اور بخار کے باعث بستر پر ہیں، دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو بلا لائیے۔“ چند ہی منٹ کے اندر ڈاکٹر آگیا جس نے قائد اعظم کا معائنہ کیا، اور بولا: ”جناب! آپ کو معمولی نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں، مگر میں آپ کو مکمل آرام کرنا چاہئے۔“

اب ہم مدراس میں تھے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے

ہزاروں مندوں میں جمع تھے۔ **قاد عظیم** اسند کرورتے کہ پہلے روز کے عام اجلاس سے خطاب نہ کر سکے مگر دوسرے روز انہوں نے صدارتی خطبہ دینے پر اصرار کیا۔ میں نے انہیں اس کے بر عکس مشورہ دیا مگر وہ اپنے فیصلے پر مصروف ہے۔ اس پر میں نے اس سے مختصر تقریب کرنے کی استدعا کی۔ انہوں نے یقین دلایا: ”ہاں، یہ تقریب بہت مختصر ہو گی۔“

جونہی وہ خطاب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اجلاس پر گہری خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے نوٹس کے بغیر فی البدیہہ تقریب کی۔ انہوں نے ہر نکتے کو وضاحت سے استوار کیا اور انہیں ایسی آسان زبان میں بیان کیا کہ اسے عام شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ خواہ وہ اس دور کی ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے یکسر نا بلدہی کیوں نہ تھا۔ انہوں نے ایک ایسے لیڈر کے انداز میں اپنے خیالات حاضرین تک پہنچائے جو نہ صرف اپنے ذہن کو سمجھتا تھا۔ بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ ان کا خطاب اختصار سے بہر حال کو سوں دور تھا، کیونکہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک تقریب کرتے رہے۔ یہ رہنمای جو صاحب فراش ہونے کیا وجد اپنے عوام کے پاس جانے کیلئے بے قرار تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی منزل مقصود کی انتہائی جرأت کے ساتھ وضاحت کر رہا تھا۔ انہوں نے کہا: ”میں آپ لوگوں کو انتہائی واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی منزل یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مکمل آزاد ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں۔ جن میں دفاع، خارجہ امور، مواصلات، کشمکش، کرنی اور ایکجیج وغیرہ جیسے امور جنمی طور پر خود ہمارے ہاتھوں میں ہوں۔ ہم کسی قسم کے حالات میں بھی آل انڈیا نویت کا آئینہ نہیں چاہتے۔ جس کے تحت مرکز میں واحد حکومت قائم کر دی جائے، ہم اس پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ایک بار ہم اس پر راضی ہو گئے تو مسلمان ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر اپنا وجود کھو بیٹھیں

گے۔۔۔ جہاں تک شمال مغربی اور شرق ہندوستان یاں ہے، وہے آزاد علاقوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں ہم نہ تو کسی طاقت اور نہ ہی کسی مرکزی حکومت کے معاون بننا کبھی قبول کریں گے۔“

مجھے ان کی کارکردگی پر فخر تھا، مگر اس فخر کے پیچے ان کی خرابی صحت کا اندریشہ بھی منڈلارہا تھا، تاہم اس عظیم اجتماع کپے پناہ جوش و خروش نے ان کے تھکے ماندے جسم کو انتہائی طاقتور ناک فراہم کر دیا تھا۔ وہ کام کے باعث اپنی کمزوری، تھکن ارو بخار کو بھول گئے۔ قیام پاکستان سے پہلے کے سات سال ان کی زندگی کا مصروف ترین ارو انتہائی ہنگامہ خیز دور تھا۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انتہک اور مسلسل جدوجہد کی اور اس کے جواب میں مسلمانوں نے انہیں اپنی خوشی سے وفاداری اور تعاون دیا۔ مسلمانوں نے انہیں محبت سے قائد اعظم، دی گریٹ لیڈر کے نام سے پکارا۔ اب قائد بھی ہندوستانی مسلمانوں کی نجات کی جدوجہد میں اپنے کردار کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ آگاہ ہو چکے تھے۔ میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی دیکھتی کہ وہ بمشکل بستر علاالت سے اٹھتے۔ ان کے چہرے پر تھکن اور اضھال کے آثار نمایاں ہوتے۔ حالانکہ وہ خاصا سمارٹ لباس پہنچتی تھی۔ ہم مسلمانوں کے عاجلوں سے خطاب کرنے کے لئے اپنی کار میں روانہ ہو جاتے۔ تمام راستے وہ نہایت خاموش رہتے۔ اس خاموشی کا مقصد خیالات کو مجتمع کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی توانائی کا ایک ایک اوس بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پیروکاروں اور مذاہوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی نگاہوں میں تھکاؤٹ اور اداسی ہوتی تھی اور وہ دونوں طرف باری باری قدرے جھک جھک جاتے اور اپنے پارٹی کے لوگوں کے سلام قبول کرتے اور انہیں پر جوش جوابی سلام کرتے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگہاتی تھیں۔ وہ ڈائس پر چلے جاتے۔ قرآن

حکیم کی چند ایک آیات کی تلاوت اور تعالیٰ رہنماؤں کی تقاریب کے بعد وہ چند قدم چل کر مائیک  
کے سامنے تشریف لے جاتے۔ اب وہ نگلی زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں پر جوش لوگوں پر ایک  
طاہر انہ نگاہ ڈالتیا اور اس کے بعد وہ ایسے لب و لبجھ اور آواز میں ان سے خطاب کرنے کا آغاز  
کرتے، گویا ان پر بڑھا پا، خرابی صحت بالکل انداز ہی نہ ہوئی ہوں۔ تقریر میں وققے کے دوران  
حاضرین ”قائد اعظم“ زندہ باد، کے نعرے لگاتے۔ وہ اپنی آواز کو عوام کے دلوں میں پیدا ہونے  
والی امیدوں، امیگوں اور مسروتوں کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے جواب تک  
خود کو کھلے آسمان تلے ہولناک اندر ہیرے کی قید میں محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ قائد اعظم کی قوم  
یہ بات نہیں جانتی تھی کہ ان کا لیڈر کس قدر تھا ماندہ، مخصوص اور جسمانی طور پر کمزور اور بیمار ہے۔  
وہ اپنی قوم کے ہیرو تھے اور ہیرو کے ہیرو پن کو بھلا کون الزام دے سکتا ہے۔؟

گھرو اپسی وہ اپنے کمرے میں بے سدھ اور جے جان ہو کر لیٹ جاتے اور ہانپتے ہانپتے  
سائس لیتے۔ تاریخی دوسرے بہت سے مشہاری کی طرح وہ تنہائی میں زیادہ آرام محسوس کرتے  
تھے، مگر ان کے اندر وہ بکتی ہوئی آگ اپنی قوم کے دلوں کو دور سے بھی گرمائے رکھتی تھی۔

خوش قسمتی سے وہ اپنی مرضی کے مطابق سونے کی صلاحیت کے بھی مالک تھے، چنانچہ دن  
بھر کی پریشانیاں اور تفکرات ان کے تحت الشعور کے باہر تک ہی مدد و درہتی تھیں، حتیٰ کہ وہ گہری  
نیند کی حالت میں بھی ان کے خیالات میں نہیں اترپاتی تھیں۔ ہر صبح کے ساتھ ان کے نام زیادہ  
خطوط، تازہ درخواستیں آ جاتیں اور نئے نئے مسائل اور بھاری بھر کم معاملات فیصلوں کے منتظر  
ہوتے۔

وہ ایک ایسی روح تھے جو خدمت کے لئے بے قرار تھی اور وہ روح ایک ایسے جسم میں تھی جو  
زیادہ کام اور خرابی صحت سے ٹوٹ چکا تھا۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سیکیوریٹی طاری رہی، بخار

قیام پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور پاکستان 14، 15 اگست کی درمیانی معرض وجود میں آچکا تھا۔ جب ہم گاڑی میں کراچی کے مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس کی جانب جا رہے تھے تو لوگوں کے انہتائی خوش اور پر جوش جھوم کو ہرگز خبر نہیں تھی کہ قائد اعظم ہم سے قدر شدید علیل تھے۔ ان کی قوم کیلئے یہ آزادی کا دن تھا اور خود قائد کے لئے یہ تکمیل کا ایک لمحہ تھا۔ منزل آگئی تھی مگر سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر ابھر نے والی اس مملکت کو ابھی کئی بڑے اور سگین مسائل کا سامنا تھا۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی تقدیر کی کشتی کو ایک محفوظ ساحل تک لے جانے کا کام ان کے ہاتھوں میں تھا اور وہ کام کی کثرت سے تھک چکے تھے۔

میں نے انہتائی افسوس اروکرب کے ساتھ دیکھا کہ کامیابی کے اس عظیم لمحے میں قائد اعظم کی جسمانی صحت کسی بھی لحاظ سے تسلی بخش نہیں تھی، ان کی بھوک برائے نام رہ گئی تھی بلکہ بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہتائی توجہ اور محبت سے بنائے گئے کھانے بھی انہیں کھانے کی طلب پر آمادہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی بھر کی اپنی مرضی سے سوچانے کی عادت اب عنقا ہو چکی تھی اور وہ مسلسل کئی راتوں تک بے خوابی کے عالم میں تکیوں پر کر دیں بدلتے اور جاگتے رہتے تھے۔ ان کی کھانی پر اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ حرارت بھی اب زیادہ رہنے لگی تھی۔ پاکستان کی سرحد کے اس پار سے مسلمانوں کے قتل عام، آبروریزی، آتش زنی اور لوث مار کے خوف زدہ کر دینے والے واقعات نے قائد اعظم کے ذہن پر شدید اثرات مرتب کئے تھے۔

جب وہ ناشتے کی میز پر مجھ سے اس قدر بڑے پیانے پر کئے جانے والے قتل عام کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نہم ہو جاتیں۔ ہندوستان سے اپنے خوابوں کی سرزی میں

پاکستان آنے والے مہاجرین کے معاشرے ان کے وطن پر افسردگی طاری کر رکھی تھی اور پھر ابھی پاکستان کا آئینہ تشکیل دیا جانا تھا۔ جب بھی انہیں وقت ملتا، وہ اپنا ذہن اس جانب مرکوز کر دیتے اور اپنے مطالعہ کے کمرے میں اکثر اس کام میں مصروف ہو جایا کرتے۔ ایسے میں وہ مختلف ملکوں کے دساتیر سے متعلق کتب میں گھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کشمیری مسلمانوں کے مسائل نے بھی ان کے ذہن کو برباد طرح متاثر کیا تھا جنہیں ایک غیر ملکی اور ظالم حکمران نے دھوکہ دیا تھا۔ پاکستان اگرچہ دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آپ کا تھا مگر ابھی اسے اپنی ہی سر زمین پر اپنی جڑیں مضبوط کرنا تھیں۔ یہی وہ مسائل تھے جن کا وہ صحیح، دوپھر اور شام تذکرہ کرتے رہتے تھے، انہیں خدشات اور وسوسوں نے ان کا ذہنی سکون ختم کر دیا تھا اور یہ ڈراؤنے خواب کی طرح انہیں پریشان کر رہے تھے۔

ہماری کراچی میں آمد کے چند روز بعد ان کے اعزاز میں کراچی کلب میں ایک عشاںیہ دیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا: ”مس فاطمہ جناح میرے لئے مسلسل امداد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ وہی ہیں۔ ان دنوں میں جبکہ مجھے اندریشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کر لے گی، یہ میری بہن ہی تھی، جس نے مجھے حوصلہ دیا اور بہت سی امید افزایا تھیں کہیں جبکہ انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ انہوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا۔“

اس وقت بھی ان کے سامعین کو ہرگز کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ان کے لیڈر کی صحت کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔

قائد اعظم کی زندگی کا مقصد تکمیل پاچ کا تھا اور انہیں تکمیل کا میراپی بھی نصیب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کا اپنی کی خدمت کے لئے اور زیادہ کام کرنے کا جذبہ مانندہ پڑا۔ عالالت کے عفریت نے ان کی بہت سی جسمانی طاقت زائل کر دئی تھی لیکن ان کے نہ دبنتے والے جذبے

نے آزادی کے ساتھ آنے والے مسائل کا حل کیلئے ان کا سر بلند رکھا۔ وہ ان مسائل کا سامنا عزم و ہمت سے کرنا چاہتے تھے تاکہ انہیں حل کرنے کی کوششیں کر سکیں۔

انہوں نے اپنی صحت کی جانب توجہ دینا بالکل ترک کر دیا تھا۔ ان کی کھانسی اور ہلکے بخار نے مجھے اور بھی زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اصرار پر وہ اپنے ذاتی فزیشن ڈاکٹر کرنل رحمن سے معاشرہ کرانے پر رضامند ہو گئے۔ وہ ڈاکٹروں کی دواوں سے غیر معمول طور پر پرہیز کرتے رہے میں کبھی اس بات کی وجہ نہ جان سکی کہ آخر ان کی زندگی بھر کی اس عادات کی وجوہات کیا تھیں۔ معاشرے کے بعد کرنل رحمن نے بتایا کہ انہیں معمولی ملیریا ہے اور وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ قائد اعظم نے اپنے ڈاکٹر سے متعدد سوالات اور استفسارات کئے جیسے وہ کمرہ عدالت میں کسی گواہ پر جرح کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر کی وضاحت سے مطمئن نہ ہونے کی پاٹھ انہوں نے اس کی تجویز کر دہا دویات استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ”مجھے ملیریا نہیں ہے۔ مجھے کام کی کثرت نے نہ ہال کر رکھا ہے۔“ اس قسم کی صورت حال میں ظاہر ہے کہ رام ہی سب سے بہترین دو اتحی، مگر آرام کرنیں سکتے تھے۔ ابھی انہوں نے بہت سے کام کرنے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: ”میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کر تو انہی کا آخری اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کر دوں گا۔ اور جب وہ بھی ختم ہو جائے گا تو میرا کام مکمل ہو چکا ہو گا۔ پھر زندگی نہیں رہے گی۔“

مہاجریں کھوکھر اپار کے رستے پاکستان آڑ رہے تھے اور قائد اعظم کیلئے قائم کئے جارنے والے کمپیوں اور دیگر انتظامات کو خود دیکھنے کی غرض سے لاہور میں موجود رہنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے دوراست تھے یا تو وہ اپنے نصب العین کو پورا کرنے کیلئے اپنا فرض سرانجام دیتے جو انہیں زندگی بھر جان سے زیادہ عزیز رہا تھا یا اپنی صحت کا خیال رکھتے جس کی خرابی سے ان کی

جان بھی جاسکتی تھی۔ انہوں نے فرض کی پکڑ پر لیکیں کہنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹروں کے مشوروں پر کوئی توجہ نہ دی۔ محمد علی جناح نے لیڈر محمد علی جناح کے آگے مکمل ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس طرح ہم کراچی میں اپنی آمد کے تقریباً ایک ماہ بعد ستمبر 1940ء میں لاہور روانہ ہو گئے۔ وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد ہم لوگ واپس کراچی آگئے۔ کراچی میں بمشکل تین ہفتے قیام کرنے کے بعد ہم لوگ ایک مرتبہ پھر اکتوبر کے آکر میں لاہور چلے گئے۔ پاکستان کا حصول قائد کی زندگی اور کام کے لحاظ سے ان کیلئے ایک دور کا اختتام اور دوسرے دور کا آغاز ثابت ہوا۔ شروع ہونے والا دوسرا دور بھی اسی قدر اہم تھا کیونکہ اس میں پاکستان کی سلامتی کو مستحکم بنانے کا اہم کام شامل تھا۔ وہ بھر ان کے اس زمانے میں اپنی قوم کو کسی صورت تباہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھ کوئی رعایت یا نرمی روانہ نہیں رکھی۔ پاکستان کی فضاؤں پر محرومی اور مایوسی کی بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ اس کی جگہ قوم میں مسرت اور امید کے جذبات پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ 30 ستمبر 1947ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ”بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ 3 جون 1947ء کا پلان قبول کرنا مسلم لیگ کی غلطی تھی، میں ایسے لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے سوا کسی بھی تبادل تجویز کو قبول کرنے کے نتائج اس قدر تباہ کن ہوتے جن کا شاید تصور بھی نہ کیا جاسکتا۔ ہم نے اپنی جانب سے اس پلان پر صاف ضمیر اور نیک نیتی کے ساتھ عملدرآمد کیا ہے، وقت اور تاریخ اس بات کو ثابت کر دے گی۔ دوسری جانب تاریخ ان لوگوں کے بارے میں بھی اپنا فیصلہ تحریر کر دے گی جنہوں نے دھوکہ دہی اور بد نیتی کے حریوں کے ذریعے فساد اور انتشار کی قوتوں کو اس برعظیم میں کھلا چھوڑ دیا، جس کے باعث لاکھوں لوگ ہلاک ہوئے۔ جائیداد اور املاک کو بے پناہ نقصان پہنچا اور لاکھوں لوگوں کو ان کے گھر بار اور ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر

اپنے گھروں سچلے جانے پر مجبور کرو یا گیا، بونیس بہت مریتیں، منظم اور مر بوط طریقے سے بے گناہ اور نہتے لوگوں کا اس طرح قتل عام کیا گیا کہ اس کے سامنے تاریخ کے بدترین ڈکٹیٹروں، ظالموں کے بڑیوں سے اور ہولناک مظالم بھی ماند پڑ گئے۔ ہم ایک سوچی سمجھی اور نہایت گہری سازش کا شکار ہوئے ہیں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں نے دیانتداری، جرأت مندی اور وقار کی پیدا دیا صولوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں شر کیان طاقتوں کے خلاف جد جہد کرنے کے لئے ایمان کی قوت اور طاقت عطا فرمائی ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر ہم قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کریں تو انشاء اللہ آخری فتح ہماری ہوگی۔“

تقریر کے دوران ایک آواز جذبات سے کاپنے لگی اور میں نے ان کی زبان سے پہلی مرتبہ موت کا تذکرہ سنا۔

”اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنے حوصلے بلند رکھئے، موت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں ہمیشہ موت کے لئے تیار رہنے کا درس دیتا ہے۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کے وقار کے تحفظ کی خاطر موت کو جرأت کے ساتھ گلے لگانا چاہئے۔ مسلمان کے لئے راہ حق میں جدوجہد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرنے سے بہتر کوئی بچاؤ نہیں..... اپنا فرض ادا کرتے رہئے اور خدا پر مکمل بھروسہ رکھئے۔ روئے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہیں جو پاکستان کو ختم کر سکے، یہ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے ہنا ہے۔“

سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ مہاجرین کیلئے جو کچھ کر سکتے تھے، انہوں نے کیا۔ وہ مطمئن تھے کہ ان لوگوں کو مناسب توجہ مل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ کراچی واپس آگئے۔ حالات کے جذباتی رخ اور قوم کو روپیش مشکلات نے نہ صرف ان کے جسم بلکہ ان کے

جذبوں اور روح تک کو تھکا دیا تھا۔ وہا کیکا بربپر بیہار بوجھے گئے۔ اس دوران نو مولو دمکت کی حکومت پر، جس نے اپنا کام ملے کے ڈھیر سے شروع کیا تھا، ذمہ داریوں کا بوجھہ دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ ان کے پاس بہت سی فائلوں کی بوچھاڑتھی اور وزراء اور سیکرٹری حضرات ان سے ہدایات لینے کے لئے ان کے پاس آتے رہتے تھے، ایسے میں قائد کے لئے آرام و سکون ملنا ناممکن تھا۔ وہ آرام کے دنوں میں بھی سرگرم عمل رہتے۔ صوبہ سرحد کے لوگوں سے ان کا وعدہ تھا کہ انہوں نے گذشتہ برس ریفرنڈم میں حیرت انگیز کام کر کے سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے کا جو فیصلہ کیا، اس کے اظہار تشکر کے لئے وہ بذاتِ خود پشاور کا دورہ کریں گے۔ یہ وعدہ نبھانے کیلئے ہم اپریل 1948ء میں پشاور گئے۔ وہاں ایک بھرپور پروگرام ان کا منتظر تھا۔ 12 اپریل کو اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

”اس موقع پر میرے ذہن میں قدرتی طور پر سب سے اہم بات تحریک قیام پاکستان کے دوران طلباء کی جانب سے میرآنے والی حمایت ہے۔ خاص طور سے اس صوبے کے طلباء کیمیں واضح طور پر یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گذشتہ برس منعقد کرائے جانے والی ریفرنڈم میں اس صوبے کو پاکستان میں شامل کئے جانے کا جو دلوگ اور صحیح فیصلہ کیا گیا، اس کے پیچھے بھی طلباء کا بھرپور تعاون کا فرماتھا۔ مجھے خاص طور سے اس بات پر فخر ہے کہ آزادی کی جدوجہد اور قیام پاکستان کے لئے کی جانے والی کوششوں میں اس صوبے کے عوام کی بھی اور کسی بھی لحاظ سے دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔“

اگلے روز ہم رسالپور گئے جہاں قائد اعظم کو رائل پاکستان ائر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرنا تھا۔ سمجھوتے کے برعکس پاکستان کو ملنے والا فوجی ساز و سامان ہندوستان نے روک رکھا تھا اور ہماری فضائیہ جہازوں اور دوسرے ضروری ساز و سامان سے

محروم تھی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا، ”میں باتا ہوں کہ آپ کے پاس جہازوں اور دوسرے ضروری ساز و سامان کی کمی ہے، تاہم مطلوبہ آلات اور ساز و سامان خریدنیکیو ششیں کی جا رہی ہیں اور جدید جہازوں کی خریداری کیلئے آرڈر دیا جا چکا ہے۔ مگر ٹیم سپرٹ اور انہتائی سخت ڈسپلن کی بغیر جہازوں یا افراد کی بڑی تعداد بھی کسی کام نہیں آسکتی۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف ڈسپلن اور خود پر اعتماد کر کے ہی رائل پاکستان ایئر فورس پاکستان کیلئے قابل قدر خدمات انجام دے سکتی ہے۔“

14 اپریل کو انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سول افسروں کا اجلاس طلب کیا اور ان میں سے اکثر کے ساتھ ملاقات کی۔ وہ ان میں بے تکلفی سے گھل مل گئے اور ایک غیر رسمی گفتگو کے دوران انہوں نے فرمایا: ”میں آپ کو سب سے پہلی بات یہی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہئے، خواہ یہ دباؤ کسی سیاسی جماعت کی طرف سے ڈالا جائے یا سیاسی شخصیت کی جانب سے۔ اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے لازم ہے کہ آپ کسی قوم کے دباؤ میں نہ آئیں بلکہ قوم اور مملکت کے سچے خادموں کی حیثیت سے اپنا فرض دیانتداری اور بے خوفی سے ادا کرتے رہئے۔ سول سروں کسی بھی مملکت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومتیں بنتی اور ٹکست کھاتی رہتی ہیں۔ وزراء عظم آتے جاتے رہتے ہیں، وزراء حکومتوں میں شامل ہوتے ہیں اور الگ ہو جایا کرتے ہیں، مگر آپ لوگ موجود رہتے ہیں، لہذا آپ پر انہتائی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کسی ایک یا دوسری سیاسی جماعت کی حمایت میں آپ کا ہرگز کوئی کردار نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح آپ کو کسی ایک یا دوسرے لیڈر کی حمایت بھی نہیں کرنا چاہئے..... یہی آپ کا کام نہیں ہے، آئین کے تحت جو بھی حکومت بنے اور معمول کے آئینی طریقے سے جو بھی وزیر اعظم یا وزیر کی حیثیت سے بر سر

اقدار آئے، آپ کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ آپ خلوص اور وفاداری کے ساتھ اس حکومت کی خدمت کریں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ اپنی سروں کی اعلیٰ شہرت، اپنا وقار اور عزت و احترام قائم رکھنے کے علاوہ سروں کا استحکام بھی برقرار رکھیں۔ اگر آپ عزم اور دیانتداری کے ساتھ کام شروع کریں گے تو آپ ہمارے نظریات اور ہمارے خوابوں کے مطابق پاکستان کی تغیر کریں گے..... ایک شاندار مملکت اور دنیا کی ایک عظیم ترین قوم۔“

اس سلسلے میں آپ پر زور دینے کے ساتھ ہی میں سیاست دانوں اور اس ملک کے رہنماؤں پر بھی اسی طریقہ زور دینا چاہوں گا کہ اگر وہ آپ کے کام میں مداخلت کریں، اور آپ پر سیاسی دباؤ ڈالیں گے تو اس سے بد دیانتی، رشوت خوری اور اقرباء پروری کے علاوہ کسی اچھی بات کو فراغ حاصل نہیں ہوگا..... جو خوفناک امراض ہیں اور جن میں نہ صرف آپ کا صوبہ بلکہ دوسرے صوبے بھی بنتا ہیں..... اگر سیاسی راہنماء آپ کے کام میں اس قسم کی مداخلت کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ وہ پاکستان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں.....

ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے بعض لوگ وزراء کو خوش نہ کرنے کے باعث ان کا نشانہ بنیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو، لیکن آپ مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ آپ کوئی غلط کام کر رہے ہیں بلکہ اسلئے کہ آپ صحیح کام کر رہے ہیں، قربانیاں دینا پڑتی ہیں، میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو آپ آگے بڑھیں اور قربانی دیں۔ بلیک لست ہونے اور پریشانی اور مصیبت میں بنتا ہونے کی صورت حال کا مقابلہ کریں، اگر آپ میں سے چند لوگوں بھی اپنی قربانیوں کا موقع دیں، یقین رکھئے ہم بہت جلد اس کا علاج ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے فرانس اور ذمے داریاں مملکت کے ساتھ دیانت داری، خلوص اور وفاداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں تو آپ بلیک لست میں نہیں رہیں گے۔ آپ ہی

ہمیں ایک ایسی طاقتور مشینری کے تیا کا وقت فراہم کرنے کے لئے جو آپ کو تحفظ کا مکمل احساس فراہم کر سکے.... آپ کو ایک فضاقائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ایسے جذبے سے سرشار ہو کر کام کرنا چاہئے کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف اور دیانتداری پر مبنی سلوگکیا جاسکے۔ محض انصاف ہی نہ کیا جائے، بلکہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔“

چند روز بعد انہوں نے پشاور میں ایڈورڈز کالج کے شاف اور طلباء سے خطاب کیا۔ انہوں نے وہ دن یاددا لایا، جب 1937ء میں انہیں اس صوبے سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تشكیت کا واقعہ یاددا لاتے ہوئے اس تبدیلی کا ذکر کیا جو گذشتہ دو تین برس کے دوران صوبے میں رونما ہوئی تھی۔ انہوں نے بہادر پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے زبردست اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ خطاب کے آخر میں قائد نے فرمایا: ”میں چاہتا ہوں کہ آزاد خود مختار مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے آپ سر بلند کر کے چلیں۔ جب آپ کی حکومت تعریف کی مستحق ہو تو آپ اپنی حکومت کی تعریف کریں، اور جب تنقید کرنے کا موقع ہو تو اس پر بے خوفی سے تنقید کریں۔۔۔ جب کوئی غلط کام ہو تو آپ بے خوفی سے تنقید کریں، میں تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔ اس طریقے سے آپ ہمارے اپنے عوام کے مفاد کے لئے زیادہ تیزی سے معاملات بہتر کر سکیں گے۔“

پشاور میں منعقد کئے جانے والے جلسہ ہائے کام میں سے ایک کے دوران آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔ جلسہ شروع ہوا تو بوندا باندی ہونے لگی مگر بارش ہونے کے اندیشے سے بے نیاز ہزاروں لوگ اپنی جگہوں پر اسی طرح بیٹھے رہے۔ میرے بھائی ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے حالانکہ میں نے جوان کے برابر ہی بیٹھی تھی، انہیں مشورہ دیا کہ ہمیں اب لازماً چلنا چاہئے۔ وہ بارش سے برمی طرح بھیگ گئے، اس کے باوجود وہ جلسے کی مکمل

کارروائی کے دوران اسی طرح بیٹھے خوب و سامنے بلکہ کرتے رہے۔ اس رات انہیں زکام ہو گیا، سردی لگ گئی اور کھانی کے ساتھ شدید بخار ہو گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلاں کے لئے میرا مشورہ مسٹر دکتر کرتے ہوئے کہا: ”کچھ بھی تو نہیں ہے، بس ذرا سردی لگ گئی ہے، میں اس پر قابو پالوں گا۔“

مگر وہ اس پر بھی قابو نہ پاسکے۔ جب ہمکراچی واپس پہنچے تو ان کی کھانی شدت اختیار کرتی گئی، اور جب اصرار کر کے ایک ڈاکٹر کو ان کا معاہنہ کرنے کے لئے کہا گیا تو پتہ چلا کہ ان پر بروکن کا مٹس (زخرے و حلق کا درم) کا معمول حملہ ہوا ہے، اگرچہ اس کے باعث وہ چند روز تک بستر میں لیٹے رہے، مگر اس کے باوجود ان فاٹکوں کا باقاعدگی سے مطالعہ بھی کرتے رہے جو انہیں بھیجی جاتی تھیں۔

تقریباً چھ بہتے بعد وہ نبتاً بہتر محسوس کر رہے تھے، تاہم کمزوری ابھی باقی تھی۔ میں انہیں مسلسل مشورہ دے رہی تھی کہ وہ کراچی سیبا ہر پاکستان میں کہیں اور چلے جائیں تاکہ کسی طرح ان کی صحت بحال ہو سکے۔ میرے استدال کی ان کے ذاتی فزیشنڈ اکٹر ٹھن نے بھی تائید کی جنہوں نے انہیں انتہائی واشگراف الفاظ میں خبردار کیا کہ اگر وہ کم از کم دو ماہ تک کام نہیں چھوڑیں گے اور مکمل آرام نہیں کر سکے گے تو ان کی صحت کو ناقابلِ تلاشی نقصان پہنچے گا۔ میں عیسکھ کا سانس لیا۔ جب جوں میں ایک روز وہ مان گئے اور انہوں نے ہاں کر دی کہ ہمیں کراچی کی شدید گرمی سے نکل کر کوئی خنک بلند یوں پر چلے جانا چاہیئے۔

کوئی آنے کے چند روز کے اندر میں نے دیکھا کیا ہے ان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہونے لگی ہے، ان کا سونا اور کھانا پینا بہتر ہو گیا تھا، کھانی کیم ہونے لگی اور نمپر پر بھی نارمل رہنے لگا۔ اب صرف نہایت اہم فاٹکیں ہی ان کے پاس بھیج جاتی تھیں جنہیں انکی توجہ کی فوری

ضرورت ہوتی تھی، کئی سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لویں آرام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ مختلف تقاریب میں شرکت کی دعویں بھی قبول کر لیتے تھے جو کوئی کے شہریوں کے مختلف طبقوں کی جانب سے دی جاتی تھیں۔ ان تقاریب میں وہ پاکستان کے درپیش اہم مسائل کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے۔۔۔ مثال کے طور پر کوئی کے پاری فرقے کی طرف سے پیش کئے گئے سپاٹنے کے جواب میں انہوں نے کہا: ”معاملات کی نوعیت ایسی ہے کہ پاکستان کے لئے نئے آئین کی تیاری میں اٹھارہ ماہ سے دو برس کا عرصہ لگ جائیگا۔۔۔“ جب انہوں نے یہ الفاظ کہے تو مجھے یاد آیا کہ آزادی کے بعد کئی موقع پر انہوں نے مجھ سے تشویش ظاہر کی کہ نیا آئین بننا چاہئے، جو لبرل ہو۔ انہوں تو قع تھی کہ اس کی تکمیل پر تقریباً دو سال لگیں گے، وہ کہا کرتے تھے: ”یہ آئین ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے شایان شان ہوگا۔“ ان کے حاس ذہن کو اس بات سے بڑی اچھی ہوتی تھی کہ ان کی بار بار کی یہاڑی کے باعث اس انتہائی اہم کام میں تاثیر ہوتی جا رہی تھی۔

خطبہ استقبالیہ کا جواب جاری رکھتے ہوئے انہوں نے پاکستان میں آباد اقلیتوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی: ”آپ جانتے ہیں کہ میری حکومت کی اور خود میری پالیسی یہ ہے کہ ذات، رنگ، عقیدے یا نسل کی تمیز روا رکھے بغیر ہر فرقے کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کیا جائے اور یہ کہ پاکستان میں مکمل امن و امان ہر قیمت پر روا رکھا جائے۔“

اگلے روز انہوں نے شاف کالج کوئی کے افروں سے خطاب کیا اور اپنے پر زور لجھے میں فرمایا: ”میں یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت اسلئے پیش آئی کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ایک دو افروں کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ

اس حلف کے منشاء سے کما حقہ آگئیں یہ بوانوں پاکستان نے اٹھایا ہے، بلاشبہ حلف اٹھانا ایک رسم ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اہم جذبے اور دل کی سچائی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم رسم ہے اور میں اس موقع پر آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کیلئے حلف کی عبارت کو دہرانا چاہتا ہوں:- ”میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر صدقی دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈوینین آف پاکستان کا وفادار ہوں گا۔ (آئین اور حکومت ڈوینین آف پاکستان کے الفاظ نوٹ کر لجھئے) اور یہ کہ میں مسلح افواج میں اپنی شرائط شمولیت کے مطابق فضا، خشکی یا سمندر میں انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دوں گا اور اپنے آفیسر کے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا۔۔۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ جذبہ ہی اصل چیز ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈوینین کے وفادار ہیں گے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ القسم موجودہ آئین کا مطالعہ کریں اور اسکے صحیح آئینی اور قانونی منشاء اور معانی کو سمجھیں۔“

15 جون 1948ء کو کوئٹہ میونسپلی کی جانب سے قائد اعظم کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ انہیں پاکستان کے ہر طبقے میں صوبہ پرستی کی لعنت کو موجود دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ عوام خود کو بلوجی، پٹھان، سندھی، پنجابی، بنگالی سمجھنے کے بجائے صرف اور صرف پاکستانی سمجھیں، اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا: ”نمائندہ حکومت اور نمائندہ اداروں کا قیام بلاشبہ بہت اچھی اور پسندیدہ بات ہے لیکن جب لوگ خود کو صرف ذاتی مفادات تک محدود کر لیں تو یہ ادارے نہ صرف اپنی قدر و قیمت کھو ڈیتے ہیں بلکہ بدنامی کا باعث بھی بن جایا کرتے ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم یہ انداز اختیار کرنے سے گریز کریں اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جیسا میں پہلے کہہ چکا

ہوں کہ ہم اپنے اعمال کو ذاتی یا بجهہ دار املاک کی کوٹ پر پرکھنے کی بجائے مخصوص مفاد کے پیانے سے جانچیں۔“

قائد اعظم ”یکم جولائی 1948ء کو کراچی میں شیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ مجھے اندریشہ تھا کہ کوئی سے کراچی تک کے سفر اور پھر ایک دو روز بعد کوئی واپسی کے باعث ان کی صحبت دوبارہ خراب نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ انہیں یہ سفر نہ کرنے پر رضامند کر لوں، میں نے ان میں مشورہ بھی دیا کہ انہوں نے اس موقع کیلئے جو تقریب تیار کر رکھی ہے، وہ ان کی طرف سے کوئی اور پڑھ لے گا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: ”تم جانتی ہو کہ کانگریس اور ہندو پیش گوئی کر چکے ہیں کہ پاکستان ایک دیوالیہ ملک ہو گا اور یہ کہ ہمارے لوگ تجارت، صنعت، بنگل، جہاز رانی اور ان سورنس وغیرہ جیسے شعبوں کو نہیں چلا سکیں گے۔ چنانچہ ہمیں لازماً ثابت کرنا ہے کہ ہمارے پاس نہ صرف سیاسی شعبے میں ٹیکنیک موجود ہے بلکہ مالیات اور بنکاری میں بھی ہمارے پاس باصلاحیت افراد کی کمی نہیں ہے، لہذا میری وہاں موجودگی نہایت ضروری ہے اور پھر اس کے بعد ہم چند روز کے اندر ہی کوئی واپس آجائیں گے۔ تم میری صحبت کے بارے میں اس قدر پریشان کیوں ہو، مجھے اپنا فرض بہر حال ادا کرنا ہے، میں اسے ملتوی نہیں کر سکتا اور تم کہہ سکتی ہو کہ میں اس سلسلہ میں کوئی خطرہ قبول نہیں کر سکتا۔“

کراچی سے کوئی سفر کے باعث ان کی حالت خراب ہو گئی۔ چنانچہ شیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کی صبح وہ اپنے بستر سے لگے پڑے تھے، وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے، اس کے باوجود اسٹھنے، تقریب کے لئے لباس زیب تن کر کے تیار ہوئے اور انہوں نے تقریب میں موجود معزز مہماںوں کے سامنے اپنا خطاب پڑھا۔ خرابی صحبت کے باوجود ان کی

”سیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبے میں ہماری مملکت کی خود مختاری کی علامت ہے ..... مسٹر گورنر جیسا کہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ غیر منقسم ہندوستان میں بنکاری زیادہ تر غیر مسلمانوں تک محدود تھی اور ان لوگوں کی مغربی پاکستان سے منتقلی سے ہماری نوزاںیدہ مملکت کی معاشی زندگی میں بڑی حد تک خلل واقع ہوا ہے۔ صنعتی و تجارتی سرگرمیوں کو مناسب انداز میں جاری رکھنے کیلئے لازمی ہے کہ غیر مسلموں کے پاکستان سے چلے جانے کے باعث جو خلاء پیدا ہو گیا ہے، اسے فوری طور پر پُر کیا جائے، ضروریات زندگی میں ہونے والے غیر معمولی اضافے نے مقررہ آمدنی والے لوگوں سمیت معاشرے کے غریب طبقوں کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ملک میں پائی جاتیوالی موجودہ بے چینی کا بھی بڑی حد تک یہی سبب ہے، حکومت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو ایک ایسی سطح پر مستحکم کیا جائے جو اشیاء تیار کرنے والوں (صنعتکاروں اور تاجریوں) اور صارفین دونوں کے لئے منصفانہ ہو۔۔۔ مغرب میں اختیار کئے جانے والے معاشی نظام نے انسانیت کے لئے نہ ختم ہونے والے مسائل پیدا کئے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ صرف کوئی مجوزہ ہی دنیا کو درپیش تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے درمیان انصاف اروپین الاقوامی سطح پر کشیدگی ختم کرنے میں ناکام ہو چکا ہے، اس کے برعکس یہ گذشتہ نصف صدی میں بڑی حد تک دو عالمی جنگوں کا باعث بنا ہے، مغربی دنیا میکانگی ترقی اور بہتر صنعتی کارکردگی کے باوجود آج ایسی بدانتظامی اور انتشار کا شکار ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مغرب کے معاشی نظریات اور طریقہ کارکو اپنانے سے ہمیں ایک خوش و خرام اور مطمئن قوم کی تشكیل میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ہمیں اپنی قسم کا فیصلہ خود اپنے طریقے کے مطابق کرنا ہو گا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی نظام

پیش کرنا ہوگا جو انسانی مساوات اور حاجی انساف کے پر اسلامی نظر یہ پرمنی ہو، صرف اسی صورت میں ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا مشن پورا کر سکیں گے اور انسانیت کو امن کا پیغام دے سکیں گے اور محض اس کے ذریعے انسانیت کے لئے مرت، فلاج و بہود اور خوشحالی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

تقریب میں موجود ہر شخص نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ قائدِ اعظم کی صحت خراب ہو چکی تھی، ان کی آواز بمشکل سنی جا رہی تھی۔ تقریر کے دوران رکتے رہے، کھانتے رہے، جب ہم تقریب سے فارغ ہو کر واپس گورنر جزل ہاؤس پہنچے تو قائد کپڑوں اور جو توں سمیت بستر میں لیٹ گئے، مگر ان کے ناتواں جسم میں نظر کو چند ہیادی نے والی ذہانت کا شعلہ اب بھی اسی طرح روشن تھا۔

اسی شام امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والے استقبالیہ میں شرکت کی دعوت بھی وہ پہلے ہی قبول کر چکے تھے۔ مگر خرابی صحت انہیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی تھی۔ انہوں نے تقریر کے لئے فوراً کپڑے بدل لئے اور ہم سفیر موصوف کی پارٹی میں جا پہنچے۔ انہوں نے تھکاوت یا کمزوری کو بالکل عیاں نہ ہونے دیا۔ استقبالیہ میں جن مہماںوں کا ان سے تعارف کرایا گیا، وہ ان کے ساتھ معمول کے مطابق باتیں کرتے رہے، یہاں کی خوش مزاجی کے نیچے کہیں دب کر رہ گئی۔ ایسے موقع پر اعلیٰ عہدہ اور پوزیشن جس قسم کی قیمت اور قربانی کا مطالبہ کیا کرتا ہے، وہ انہیں بہر حال ادا کرنا تھی، اور انہوں نے یہ قیمت مسکراتے ہوئے ادا کی۔

کراچی میں پانچ روز قیام کے دوران انہوں نے بعض انتہائی اہم فائلیں دیکھیں اور دیگر کام کیا۔ اسکے بعد ہم لوگ ہوائی جہاز سے کوئی واپس لوٹ آئے۔ اگرچہ ہوائی سفر کے دوران

وہ ٹھیک رہے مگر اگلے ہی روز اس کی طبیعت میں پریشان اور تھاکاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہلاکا بخار بدستور موجود تھا جس سے ان کی بے آرامی اور میری تشویش بڑھنی تھی۔ ایک بار پھر کوئی میں مختلف اداروں کی طرف سے انہیں دعوت نامے موصول ہونے لگے اور بہت سے افراد اور لیڈروں کی طرف سے مطالبات ہونے لگے جو قائد اعظم کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ قائد اعظم کو افسوس تھا کہ خرابی صحت کے باعث وہ ان لوگوں کی خواہشات کا مزید احترام نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم کوئی سے زیارت چلے جائیں جو قریب ہی واقع ہے اور جہاں کا موسم کوئی سے زیادہ ٹھنڈا اور بقیناً زیادہ آرام دہ ہوگا۔

زیارت کی ریڈی ٹینسی جہاں ہم تھے، وہ ایک پر منظر، پرانی اور دو منزلہ عمارت تھی، جو ایک بلند و بالا پہاڑی پر کسی مستعد چوکیدار کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے لان اور باغ و سیع ہیں، جہاں پر نمے صبح نغمہِ حمد گاتے اور شام کو چھپھاتے، پھلدار درختوں کا ایک جھنڈا اور پھولوں کے تنخیتی یہاں کے منظر کی خوبصورتی کو اور دو بالا کرتے۔ قائد اعظم اس کی خاموشی اور دلکشی پر فریفہ ہو گئے۔

کمشنر کوئی ڈویژن کی اہلیہ مسز خان نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ اپنے ایک مریض کو دیکھنے کے لئے زیارت آئے ہوئے ہیں اور ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے قائد اعظم کا معاونہ کرانا مفید رہے گا، جب میں نے یہ تجویز اپنے بھائی کے سامنے رکھی تو انہوں نے سختی سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انہیں کوئی زیادہ سگلیں مرض لاحق نہیں ہے اور اگر صرف ان کا معدہ خوراک کو ذرا بہتر طور پر ہضم کرنے لگے تو وہ جلد ہی دوبارہ تند رست ہو جائیں گے، لیکن ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کریں، یہ کھائیں، کس قدر کھائیں، کب سوئیں، کب تک سوئیں وغیرہ جیسی ہدایات سے ان کے گریز کی عمر بھر کی عادت بدستور قائم تھی۔

اب تک وہ اپنا تفصیلی معرفہ کرانے اور نو کو مکمل لور پر ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے انکار کرتے آئے تھے۔ انکا خیال تھا کہ وہ صحت کو اپنی مرضی کے تابع رکھ سکتے ہیں، مگر اب انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی یہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہو گئی اور اس طرح پہلی بار ان کی صحت نے خود انہیں خطرے کا الارم دین اشروع کیا۔ ایک روز علی الصبح جب انہوں نے رضامندی ظاہر کی کہ اب انہیں اپنی صحت کے بارے میں مزید خطرات مول نہیں لینے چاہئیں، انہیں مناسب طبی مشورے اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے، مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر قائد اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر فرخ امین سے کہا کہ وہ کا بینہ کے سیکرٹری جزل چودھری محمد علی سے یہی فون پر رابطہ قائم کریں اور ان سے کہیں کہ وہ لا ہور کے نامور فزیشن جزل ڈاکٹر کریل الہی بخش کو فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز زیارت بھجوانے کا انتظام کریں۔ یہ 21 جولائی 1948ء کا واقعہ ہے۔

پیغام بھیجا جا چکا تھا اور ہم انتہائی بے تابی سے کریل الہی بخش کی آمد کے منتظر تھے، قائد اعظم کی حالت مسلسل خواب ہوتی جا رہی تھی، لیکن جسمانی تکالیف کے باوجود ان کا ذہن بدستور چاق و چوبندا اور بیدار تھا۔ ان کی روح اور جذبات نہ مرجھائے تھے اور نہ ان پر پڑھ مردگی کے کوئی آثار تھے۔ انہوں نے زندگی میں بہت سی جنگیں جیتی تھیں اور انہوں نے خرابی صحت کے خلاف بھی اعتناد کے ساتھ جدوجہد کی تھی۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی جدوجہد کے راستے پر چلتے ہوئے گذاری تھی اور وہ اس کا اختتام اطمینان اور سکوت کی راکھ کے ذہیر پر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے نئے آئیں، کشمیر اور مہاجرین کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں ان کے الفاظ پوشیدہ میں ان کی روح کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی کہ ان کی حالت اب ایک ایسے شخص کی سی ہو رہی تھی جو بہت سے کام کرنا چاہتا ہو مگر اس کے

پاس نہیں سرانجام دینے کیلئے بہت تھوڑا وقت اور بہت محدود تھا اسی کی وجہ سے اس کا فرض سنجدال لے۔

23 جولائی 1948ء بروز جمعہ شام ڈھلنے مجھے فرخ امین کی زبانی جان کر اطمینان ہوا کہ کریل الہی بخش پہنچ چکے ہیں اور قائد اعظم کے معاشرے کے لئے چکلی منزل پر منتظر ہیں۔ میں نے یہ خوشخبری اپنے بھائی کو سنائی تو انہوں نے جوش سے خالی لبھے میں کہا: ”ڈاکٹر سے کہو کہ وہ کل صبح معاشرے کیلئے آئیں، اب شام زیادہ ہو چکی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے ڈسٹریکٹ کرے۔“ ڈاکٹر کی آمد کی خبر کو انہوں نے جس انداز میں لیا تھا، اس پر مجھے حیرت ہوئی اور میں نے محبت بھرے انداز کا سہارا لے کر ان سے التجا کی کہ وہ ڈاکٹر کو اپنا معاشرہ کرنے کی اجازت دے دیں کیونکہ اپنی زندگی سے کھلینا دلنش مندی کی بات نہیں۔ اس کے جواب میں ان کے چہرے پر ایسی دلکش مسکراہٹ پھیل گئی کہ مجھے تکمیل طور پر پسپا ہوتے ہوئے ان کی بات ماننا پڑی۔

اگلی صبح میں کریل الہی بخش کو قائد اعظم کے پاس لے گئی اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر مریض سے کوئی سوال کرتا، انہوں نے کہا: ”ڈاکٹر! مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خوشنگوار گذر را ہو گا۔“ اس کے بعد ڈاکٹر الہی بخش نے قائد سے ان کی یماری سے متعلق اور اس کی سابقہ علامات وغیرہ سے متعلق دریافت کیا۔ قائد اعظم نے 1934ء سے لے کر اب تک اپنی یماری کی منتشر تفصیل ٹھیک ٹھیک ڈاکٹر کو بتا دی اور اس گفتگو کے دوران ان کا تمام تر زور اس بات پر رہا کہ وہ بھلے چنگے ہیں اور یہ کہ وہ جلد ہی معمول کے مطابق دوبارہ کام کرنے لگیں گے اور پروگرام کے مطابق اپنی دوسری مصروفیات پر بھی عمل پیرا ہو جائیں گے، بشرطیکہ ان کا معدہ ٹھیک ہو جائے۔

”میں گذشتہ چودہ برس سے روزانہ چودہ گھنٹے کام کر رہا ہوں، صحیح معنوں میں مجھے کبھی علم ہی نہیں ہو سکا کہ یہاں کیا چیز ہوتی ہے، تاہم گذشتہ چند برس سے مجھے اکثر کھانی اور بخار کی شکایت رہنے لگی ہے مگر چند روز کے آرام سے میں ان دونوں پر قابو پا لیتا ہوں۔ حال ہی میں ان کی شدت اور تو اتر زیادہ ہونے لگا ہے، اور انہوں نے مجھے نہ حال کر دیا ہے۔“

یہ چند جملے ادا کرنے کے دوران قائد اعظم تھک چکے تھے۔ ڈاکٹر نے ان کی نبض دیکھنے کے لئے ان کا بایاں بازو تھام لیا۔ میریض بار بار کھانس رہا تھا، انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا: ”چند ہفتے قبل مجھ پر سردی اور زکام کا حملہ ہوا اور میں پنسلین لوزنجس (Pencilin) استعمال کرتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ بنیادی طور پر مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ میرا معدہ ہی تمام تر مشکلات اور یہاں کا باعث بنا ہوا ہے۔ تقریباً پندرہ برس پہلے لندن میں بعض ڈاکٹروں نے مجھے معدے کا آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر جب میں نے جرمنی میں بعض ڈاکٹروں سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہی دنوں سببی میں میرے ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ مجھے دل کی یہاں کیا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ خود ڈاکٹروں کی رائے بھی ایک نہیں ہے۔“

جب کرنل الی بخش ان کا تفصیلی معاہنہ کر چکے تو انہوں نے کہا:

”سر! آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے مگر میں آپ کا سینے اور پیچ پھردوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کے خون اور تھوک کا معاہنہ کروں گا اور اس کام کیلئے مجھے ضروری آلات، ساز و سامان اور چن دمعاون ڈاکٹروں کی ضرورت ہوگی۔“

قائد اعظم خاموشی سے ڈاکٹر کی باتیں سنتے رہے۔ اس نے کہا کہ ”سر آپ کو لازمی طور پر

آپ ناشتے میں دلیہ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی، کافی اور دودھ کی کافی مقدار استعمال کریں۔ دوپہر کے کھانے میں مرغی کا قیمه، سبزیاں اور کشڑیا جیلی کھائیں اور رات کے کھانے میں بھنی ہوئی مچھلی اپنی پسندیدہ چننی کے ساتھ استعمال کریں۔ اس کے علاوہ سبزیاں، پھل، پڈنگ اور کافی بھنی استعمال کریں۔

”یہ تو بہت زیادہ ہے ڈاکٹر۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا میرا کمزور معدہ اس قدر خوراک برداشت کر سکے گا؟“

”سر! آپ کو زیادہ کیلو ریز والی خوراک کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے مریض کے لئے یہ از حد ضروری ہے۔“

اگلی صبح کوئہ کے سول سرجن ڈاکٹر صدقی اور کلینیکل پتھالوجسٹ ڈاکٹر محمود ضروری ساز و سامان اور آلات کے ساتھ ریڈیپنی پہنچ گئے۔ انہوں نے قائد اعظم کے خون اور تھوک کے نمونے لئے اور اسی روز بعد دوپہر مجھے یہ منہوس خبر ملی کہ نتیجہ قطعی تھا۔ مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین کھکھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کیا کر سکتی تھی؟ میں نے مناسب سمجھا کہ کریل کو چاہئے کہ وہ قائد اعظم کو ان کے مرض کے متعلق بتا دیں کیونکہ میرے خیال میں خواراک، آڑام اور علاج ہر معاملے میں ان کا مکمل تعاون حاصل کرنے کا صرفیہ ایک طریقہ تھا۔ جب کریل الہی بخش قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے غیر ضروری تشویش سے خالی لبجھ میں کہا: ”سر! مجھے اندر یہ ہے کہ کلینیکل ٹیٹھوں کے نتائج کے مطابق آپ کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہو گیا ہے۔“

قائد اعظم نے یہ خبر خاموشی سے سنی اور چند منٹ کے بعد انہوں نے کہا: ”اس کا مطلب یہ

کریل الٰہی بخش ان کی بات سن کر خاموش رہا: ”ڈاکٹر ذرا بتائیے کہ مجھے یہ شکایت کتنے عرصے سے ہو سکتی ہے؟“ قائد اعظم نے استفسار کیا۔

”سر! میرا خیال ہے یہ مرض کم از کم دو برس پر انا تو ضرور ہے، مگر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے میں آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں، مرض زیادہ ٹکلیں نہیں ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے اور اگر آپ کا جسمانی نظام علاج سے ہم آہنگ ہو گیا تو آپ جلد ہی بالکل تند رست و توانا ہو جائیں گے۔“

”کیا مس جناح اس کے بارے میں جانتی ہیں؟ کیا آپ نے انہیں میرے مرض سے آگاہ کر دیا ہے؟“

”لیں سر، میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“

میرا خیال ہے، آپ نے ایسا کر کے غلطی کی ہے کیونکہ وہ ایک خاتون ہیں۔“ عین اسی لمحے میں کمرے میں داخل ہوئی اور قائد اعظم نے ڈاکٹر سے پوچھا: ”آپ کے خیال میں مجھے کب تک بستر میں رہنا پڑے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ میری بہت سی ذمہ داریاں ہیں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔“

”سر، اس سوال کا کوئی فوری جواب دینا قبل از وقت ہو گا مگر آپ کو جلد از جلد سختیاب کرنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کی جائے گی۔“

اپنے بھائی کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب، بے پناہ تھکن اور پڑ مردگی کی غمازی کرتا تھا، ان کی دل جوئی کرنے کیلئے میں تھا تھی۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائے اور کہا: ”فاطمی! تم نے دیکھا، تم درست ہی کہا کرتی تھیں..... مجھے پیش لست سے پہلے مشورہ

کرنا چاہئے تھا.... مگر مجھے کوئی فوں نہیں ہے، آئی مرد جد و جہد کر سکتا ہے..... تقدیری کی زبان ہمیشہ گوئی ہوا کرتی ہے..... میں اپنے فرائض اس وقت تک انجام دیتا رہوں گا، جب تک میں انہیں ادا کرنے کے قابل ہوں.... تم جانتی ہو میرا ہمیشہ سے اصول رہا ہے... کہ میں کبھی آنکھیں بند کر کے... دوسروں کے مشورے قبول نہیں کیا کرتا... میں نے ہمیشہ اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق عمل کیا ہے... اور میں نے زندگی کی شدید مشکلات سے سیکھا ہے۔“

چند ماہ قبل انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ”آپ زندگی کے دوران درپیش مشکلات اور قیمتی تجربے سے بہت کچھ سیکھیں گے۔“ اپنے مخصوص طریقہ کار اور مشکلات سے سیکھنے کا انداز زندگی بھراں کے کردار کی نمایاں خصوصیت رہا تھا۔

یہ بات کافی حوصلہ افزاء تھی کہ گذشتہ کئی ہفتوں کے مقابلے میں اب وہ زیادہ مقدار میں کھانا کھانے لگے تھے۔ غذا بڑھانے کی غرض سے میں نے امانت علی کو باور پھی کے طور پر رکھ لیا جس نے کھانا پکانے کا فن پیرس کے رنز ہوٹل میں سیکھا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک مہاراجہ کپور تھلہ کا باور پھی بھی رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر الہی بخش نے قائد اعظم کا ٹپر پھر وغیرہ نوٹ کرنے کیلئے ایک خاتون کمپاؤنڈ کو بھی اپنے عملے میں شامل کر لیا۔ پہلی بار قائد اعظم نے اس خاتون سے پوچھا: ”میرا ٹپر پھر کتنا ہے؟“ اس پر اس نے مضبوط لبجھ میں جواب دیا۔

”سر! یہ میں صرف ڈاکٹر کو بتا سکتی ہوں۔“ قائد اعظم نے اصرار کیا: ”مگر میں اپنا ٹپر پھر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ خاتون کمپاؤنڈ راپنے موقف پر ڈالی رہی۔ ”سوری سر! میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“

جونہی لیڈی کمپاؤنڈ کمرے سے باہر گئی تو قائد اعظم عسکرائے اور انہوں نے مجھ سے

کہا: ”میں اس قسم کے لوگوں کو پہنچ کر رہا ہوں، ایسے لوگ جو مضموم ارادہ کے مالک ہوں۔۔۔ اور جو خوفزدہ ہونے سے صاف انکار کر دیں۔“

ان دنوں کسی کو قائد اعظم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی، مگر جب واشنگٹن میں متعین پاکستانی سفیر مسٹر حسن اصفہانی زیارت میں ہمارے گھر آئے تو قائد اعظم مسٹر اصفہانی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ قائد اعظم کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھے۔ اپنے لیڈر کو دیکھ کر جب مسٹر اصفہانی نیچے اترے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ اس ماہر سیاستدان کو جس نے بہت سی سیاسی لڑائیاں لڑی تھیں، بے بسی سے بستر میں پڑے ناتوانی کے ساتھ اپنی زندگی کی جنگ لڑتے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر الہی بخش کو بتایا کہ انہیں قائد اعظم کیلئے امریکہ سے ضروری سپیشلٹ ڈاکٹر اور مطلوبہ ادویات بھجوا کر بے حد خوشی ہو گی۔ ڈاکٹر الہی بخش نے جواب دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ بخوبی مسٹر اصفہانی سے ایسا کرنے کے لئے کہیں گے۔

اس اثناء میں ڈاکٹر الہی بخش کی درخواست پر لاہور سے ڈاکٹر ریاض علیشاد، ڈاکٹر عالم ایکسرے سپیشلٹ اور کلینیکل پتھاروجسٹ ڈاکٹر غلام محمد ایکسرے اور دوسرے ضروری آلات اور ساز و سامان کے ساتھ زیارت پہنچ گئے۔ ان کے معاٹے اور ٹشوں کے نتیجے میں ڈاکٹر الہی بخش کی رائے اور تشخیص کی تصدیق ہو گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قائد کے پاس رات کے وقت کسی نر کو موجود رہنا چاہئے۔ پہلے تو قائد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے اور یہ کہ نائٹ ڈیوٹی کیلئے علیحدہ سے نر رکھنا پیسے کافی نہ ہو گا۔ مگر بالآخر وہ راضی ہو گئے اور انہوں نے کہا: ”گذشتہ کئی ہفتوں سے..... میری بہن دن رات میری دیکھ بھال کر رہی ہے..... وہ یقیناً تھک گئی ہو گئی... باں آپ رات کے لئے کوئی نر رکھ لیجئے۔ اس

طرح سول ہسپتال کوئئی میں کام کرنے والی نرنس فلز وہی زیارت آگئی۔ وہ انہیاں میں مستعد نرنس ثابت ہوئی اور اس خوبی کے باعث قائد اعظم اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سسرڈنہام نے ڈاکٹر الہی بخش کو بتایا کہ قائد اعظم مسلکی پاجامہ پہننے ہیں، جو انکی زندگی بھر کی عادت تھی اور اس کے باعث وہ اکثر رات کو سردی سے کاپنے رہتے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر نے کراچی سے ایک ڈائیلیلا (Viyella) منگوایا اور میں نے قائد کیلئے چند پاجامے بنوادیے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پر سکون نظر آنے لگے تھے۔ کئی کئی گھنٹے سوئے رہتے اور خوراک بھی اب وہ کافی مقدار میں کھانے لگے تھے۔ اس سے ہمارے لئے امید کی کرن پیدا ہو گئی۔ ان کا ٹپر پچھرا بنا رہے لگا تھا۔ ان کی کھانسی پر کافی حد تک قابو پالیا گیا تھا اور بلڈ پریشر بھی اب تشویشناک نہیں تھا۔

جو لائی کے اوآخر میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کسی پیشگوئی اطلاع کے بغیر چودھری محمد علی کے ہمراہ زیارت آگئے۔ انہوں نے ڈاکٹر الہی بخش سے قائد اعظم کی صحت کیا رے میں دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے کہا: چونکہ وہ میرے بلا نے پر قائد اعظم کے معائنے اور علاج کے لئے یہاں آئے ہیں، اس لئے وہ انہیں (لیاقت علی خان کو) اپنے مریض کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔

”مگر حکیمت وزیر اعظم میں انکی صحت کے بارے میں جانے کیلئے بے تاب ہوں۔“

ڈاکٹر نے شاستری سے جواب دیا ”لیں سر، مگر میں مریض کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔“

جب مجھے بتایا گیا کہ وزیر اعظم اور سیکرٹری جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں، میں فوراً قائد اعظم کے پاس پہنچی اور ان لوگوں کی آمد کی اطلاع دی۔ ..... چند منٹ بعد قائد اعظم نے فرمایا ”یچے جائے۔۔۔۔۔ وزیر اعظم کو بتائیئے کہ۔۔۔۔۔ میں ان سے ملاقات کروں گا۔“

”اسوچت دیر ہو چکی ہے، آپ ان لوگوں کے کل صحنے کر لیجئے۔“  
<http://libraryofurdubooks.blogspot.com>

”نہیں، نہیں، اسی وقت آنے دیجئے۔“

قائد اعظم اور لیاقت علیخان کے درمیان ملاقات تقریباً نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ جو نہیں لیاقت علیخان پھلی منزل پر آئے، میں اور پر اپنے بھائی کے پاس چل گئی۔ وہ بڑی طرح تھک چکے تھے اور انکی آنکھوں سے بھی یکاری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے فروٹ جوں لانے کو کہا اور پھر بولے: ”مشریف محمد علی کو بھجواد تجھے۔۔۔“ کابینہ کے سیکرٹری جنرل تقریباً پندرہ منٹ قائد اعظم کے ساتھ رہے۔ جب قائد ایک بار پھر تنہا ہوئے تو میں ان کے کمرے میں چل گئی اور ان سے پوچھا کہ وہ جوں پینا پسند کریں گے یا کافی۔ مگر انکا ذہن میری بات کا جواب دینے کی بجائے شاید کسی اور ہی بات میں الجھا ہوا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا: ”بہتر ہو گا۔۔۔ آپ نیچے جائیں۔۔۔ اور ان لوگوں کے ساتھ۔۔۔ کھانا کھائیں۔۔۔“

نہیں۔۔۔ یہ درست نہیں۔۔۔ وہ یہاں ہمارے۔۔۔ مہمان ہیں۔۔۔ جائیے۔۔۔ جا کر انکے ساتھ کھانا کھائیے۔۔۔“

14 اگست قریب آرہا تھا۔ جب ہماری قوم کو آزادی کی پہلی سالگرہ منانا تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے کے بر عکس قائد اس موقع پر قوم کے نام پیغام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ خرابی صحت کے باوجود اس پیغام کی تیاری کے لئے کام کر رہے تھے۔ یوم آزادی کے روز جاری کئے جانے والے پیغام میں کہا گیا تھا:

”یاد رکھئے پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔۔۔ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے۔۔۔۔۔۔ اس نوزائیدہ مملکت کا پیدائش کے وقت ہی گلا گھونٹ دینے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ہمارے دشمنوں کو اب بھی امید ہے کہ وہ اقتصادی

ہنگانڈوں کے ذریعے اپنا وہ متعددی حصل کرتے ہیں کامیاب ہو جائیں گے جو انکے دل میں ہے تعصباً اور بد دیانتی جس قدر دلائل مہیا کر سکتے ہیں، اور ان کے ذریعے جتنے بھی بہانے بنائے جاسکتے ہیں، ان تمام کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے (ہندوؤں نے) پیشگوئی کی تھی کہ پاکستان دیوالیہ ہو کر رہ جائیگا۔ دشمن کی گولی اور تکوار جو مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، وہ مملکت کی تباہ شدہ مالی اور اقتصادی حالت کے باعث پورا ہو سکتا ہے۔ مگر برائی کے پیغمبروں کے تمام تر دعوے باطل ثابت ہو چکے ہیں..... ہمارا اولین بجٹ ہی ایک فاضل بجٹ ہے۔ تجارت کا توازن بھی ہمارے حق میں رہا ہے اور اقتصادی شعبے میں بخششیت مجموعی ترقی ہو رہی ہے۔“

چند روز بعد ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ قائد اعظم کا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے۔ ان کے پاؤں پر ورم آگیا ہے اور ان کے پیشتاب کی مقدار بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ باہم طویل صلاح مشورے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ قائد اعظم گردوں کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ ان کی صحت کے باعث زیارت میں ان کا قیام موزوں نہیں ہے، قائد اعظم نے اس مشورے سے اتفاق کیا مگر انہوں نے اصرار کیا کہ انہیں 14 اگست کے بعد ہی کوئی منتقل کیا جائے کیونکہ اس روز ہماری آزادی کی پہلی سالگرہ منانی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر اس وقت تک انتظار کرنے کیلئے تیار نہ تھے اور اس طرح بالآخر ہم لوگ 13 اگست کو زیارت سے کوئی روائی کے لئے تیار ہو گئے۔

قائد اعظم نے اصرار کیا کہ وہ پاجامہ سوٹ میں سفر نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بقول انہوں نے اپنی پوری زندگی کیدوران کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ میں خوش تھی کہ وہ مسلسل زندگی سے لچکی کا اظہار کر رہتے تھے۔ چنانچہ میں ان کے لئے ایک بالکل نیا سوٹ نکال لائی جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پہننا تھا۔ اس کے ساتھ مجھ کرتی ہوئی ثانی بھی نکالی اور رومال سوٹ کی

آرائشی جیب میں سجادیا۔ چمکدار پپ شر انہیں پہنائے۔ انہیں ایک سڑپچھر پر لٹا کر ریڈ یڈنسی کی دوسری منزل سے نیچے لا یا گیا اور تکیہ لگا کر نیم دراز پوزیشن میں ایک بڑی بھر کار کی چھپلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ اس کار میں ہم نے زیارت سے کوئی کا سفر کیا۔ میں ان کے بالکل برابر بیٹھ گئی اور سڑ ڈنہا م کو اضافی کری پر بٹھا دیا گیا۔ ان کا اے ڈی سی اگلی سیٹ پر شوفر کے برابر بیٹھ گیا۔

جھنکلوں اور جھنکلوں سے نیچے کے لئے کارست رفتار سے سفر کرتی رہی۔ راتے میں ہم دو بار رکے اور میں نے انہیں چائے اور سکٹ وغیرہ دیئے۔ ہمیں کوئی پہنچنے میں چار گھنٹے لگے اور مجھے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہا کہ آیا وہ اس سفر کی صعوبت کو برداشت بھی کر پائیں گے یا نہیں۔ کوئی ریڈ یڈنسی پہنچتے ہی جہاں ہمیں قیام کرنا تھا، ڈاکٹروں نے انکا معاہنہ کیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا کہ قائد اعظم بخیریت طے ہوا ہے۔ قائد نے چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹروں سے کہا: ”میں یہاں زیادہ بہتر محسوس کر رہا ہوں..... زیارت میں..... مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔“

ان کی صحت اب بہتر ہونے لگی تھی، اس پر ڈاکٹر الی بخش نے مشورہ دیا کہ وہ روزانہ تقریباً ایک گھنٹہ فاٹلوں وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہر وقت صحت کے متعلق سوچتے رہنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ قائد اعظم کے مستعد ہن کو کام کی جانب مبذول کر دیا جائے۔ قائد بہت خوش تھے اور انہوں نے اس آزادی کا بڑے مزے سے لطف اٹھایا، چند روز کے بعد ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ وہ بستر سے نکل کر ان کی مدد سے اپنے کمرے کے اندر ہی چند قدم چل لیا کریں، تاکہ اس عمل سے ان کے خون کی گردش میں آسانی پیدا ہو سکے۔ انہوں نے ڈاکٹروں کا یہ مشورہ خوشی سے قبول کر لیا۔ وہ ایک بار پھر خوش تھے کہ کئی

ہفتوں کے بعد وہ یہاڑی سے ڈاکٹر ہونے کے ڈال ہو چکے تھے۔ یہ بات خاصی حوصلہ افزائی تھی کہ ان میں ابھی تک جدوجہد جاری رکھنے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ جب انہوں نے ڈاکٹروں کو مندرجہ ذیل کہانی سنائی تو اس سے ان کی صحت کیبارے میں پیدا ہونے والی امید یقین میں بدلتی نظر آنے لگی۔

ڈاکٹر میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گا۔ ایک عورت نے اپنے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ چل نہیں سکتی کیونکہ وہ کئی ماہ تک یہاڑی ہی ہے اور بستر سے نہیں نکلی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ صحتیاب ہو چکی ہے، اسلئے ضروری ہے کہ وہ بستر سے نکل آئے اور چلن اشروع کر دے۔ ڈاکٹر کے تمام تر دلائل کے باوجود عورت نے انکار کر دیا۔ تب ایک دوسرا ڈاکٹر آیا۔ اس نے عورت کا معائنہ کیا اور اس نے بھی وہی مشورہ دیا۔ یہاں پہنچ کر قائد اعظمؐ بے دم ہو کر سائنس لینے کے لئے رکھ دیا۔ عورت نے محسوس کیا کہ اس کا بستر جلد ہی شعلوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔۔۔ اس پر وہ عورت جلدی سے بستر سے چھپتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ہم سب یہ کہانی سن کر ہنس دیئے۔ ”ڈاکٹر، کیا آپ بھی میرے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں؟“

پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا: ”ڈاکٹر، میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں، میں نے کئی روز سے سگریٹ نوشی نہیں کی۔۔۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟“

ڈاکٹر الہی بخش نے پریقین لجھے میں کہا: ”لیں سر، صرف ایک سگریٹ روزانہ سے شروع کیجئے، مگر اس کا دھواں نہیں نکلنے گا۔“

میں ان کے پسندیدہ براٹڈ کے سگریٹ کریون اے کا کارڈ نکال لائی۔ وہ سدا سے بلا کر سگریٹ نوش رہے تھے اور دن بھر میں تقریباً پچاس سگریٹ پی جاتے تھے۔

شام کو ڈاکٹر پھر آیا۔ اس نے لشکر میں گریٹ کے پانچ جلے ہوئے تکڑے پڑے دیکھے تو دریافت کرتے ہوئے اپنے مریض کی جانب دیکھا، قائد اعظم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ”ہاں، ڈاکٹر! میں نے پانچ سگریٹ پی لئے ہیں، مگر میں نے انکا دھواں نہیں نکلا۔“ اس کے بعد وہ کھلکھلا کر بنے، ایک پچے کی طرح خوش۔

اس سال عید الفطر 27 اگست کو آرہی تھی اور وہ عید کی مناسبت سے قوم کے نام اپنا پیغام تیار کرنے میں مصروف تھے۔ یہ پیغام ان کی سینکڑوں تقاریر کا اختتام ثابت ہوا جو انہوں نے اپنی طویل سیاسی کیریئر کے دوران تیار کی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیغام میں لکھا:

”صرف مشترکہ کوششوں اور مقدار پر یقین کے ساتھ ہی، ہم اپنے خوابوں کے پاکستان کو حقیقت کا روپ دے سکتے ہیں....“

گذشتہ عید الفطر جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد آئی تھی، مشرقی پنجاب کے المناک واقعات کے باعث ہمارے لئے اپنے ساتھ لانے والی خوشیاں کھوچکی تھی۔ گذشتہ سال کے خونی واقعات اور ان کے نتیجہ میں..... لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ان واقعات نے عدمِ الشال قسم کی مصیبت کھڑی کر دی۔ بے گھر انسانوں کو نئے سرے سے آباد کرنے میں ہماری تمام تر توانائیاں صرف ہو گئیں تھیں، اور ہمارے وسائل اختتام کی آخری حدود کو چھوٹے لگے۔ اس کام کی شدت اور وسعت نے ہم سب کو بڑی طرح متأثر کیا تھا اور مشکلات کے اس سیلا ب میں صرف ہمارے سرہی پانی سے باہر رہ گئے تھے۔ بارہ ماہ کا مختصر عرصہ تمام مہاجرین کو جو پاکستان میں آپکے تھے، منافع بخش روزگار مہیا کرنے کیلئے کافی نہیں تھا۔ ان کی دوبارہ بحالی کیلئے خاطر خواہ کام کیا جا چکا ہے، مگر انکی کافی تعداد کو بحال کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ ہم اسوقت تک خوشی نہیں منا سکتے، جب تک ان میں سے ہر ایک دوبارہ

اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ مجھے پسند یقین ہے کہ اگلی بیانک یہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ حل کر لیا جائیگا اور تمام مہاجرین کو پاکستانی معیشت میں مفید شہریوں کی حیثیت سے جذب کر لیا جائیگا۔“

اپنا پیغام چاری رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا:

”برادر مسلم ممالک کیلئے میرا پیغامِ عیدِ دوستی اور خیر سگالی پرمنی ہے، ہم سب ایک خطرناک دور سے گذر رہے ہیں۔ طاقت کی سیاست کا ڈرامہ جو فلسطین، اندونیشیا اور کشمیر میں کھیلا جا رہا ہے، اس سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ صرف ایک متحده محااذ کے قیام کے ذریعے ہی ہماری آواز دنیا کے ایوانوں میں سنی جا سکی ہے۔ چنانچہ میں آپ سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اسے خواہ کوئی بھی زبان دیں، مگر میرے مشورے کی روح یہ ہے کہ: ”ہر مسلمان کو دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہئے۔“

یہ قائدِ اعظم کے آخری ریکارڈ شدہ الفاظ ثابت ہوئے:

”اگست کے آخری دنوں میں قائدِ اعظم اچانک ہر چیز سے بے نیاز نظر آنے لگے اور ایک روز انہوں نے انہاک سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ”فاطمی، مجھے اب مزید زندہ رہنے سے.... کوئی دلچسپی نہیں،.... میں جتنی جلدی چلا جاؤں.... اتنا ہی بہتر ہو گا۔“

یہ بدشگونی کے الفاظ تھے۔ میں کانپ گئی، جیسے میں نے بھلی کے ننگے تار کو چھوپ لیا ہو، مگر میں نے خود کو پر سکون رکھتے ہوئے کہا: ”جن! آپ جلدی اچھے ہو جائیں گے، ڈاکٹر پر امید ہیں۔“

وہ مسکراتے، ایک مردے کی مسکراتہ: ”نہیں۔۔۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“

کیم ستمبر کو ڈاکٹر الہی بخش نے مجھ سے مایوس لجھے میں کہا: ”قائدِ اعظم پر ہمیرج کا حملہ ہوا

ہے، میں پریشان ہوں، ہمیں نہیں کراچی لے جا پا ہے، کوئی جیسے شہر کی بلندی ان کے لئے موزوں نہیں ہے۔“ ان کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی اور 5 ستمبر کو ان کے تھوک کے معانے سے ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ ان پر نمودنے کے حملے کے آثار نمایاں ہیں۔ خون کے معانے سے یہ بھی پتہ چلا کہ انہیں شدید انفیکشن ہو چکا ہے۔ انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس پر ڈاکٹروں نے انہیں آسیجن دینا شروع کر دی۔ 7 ستمبر کو میں نے واشنگٹن میں مسٹر اصفہانی کے نام تار دیا کہ وہ فوراً امریکہ سے اس پیشہ کو بھجوائیں جس کا نام ڈاکٹر ریاض نے تجویز کیا تھا۔ اس سے اگلے روز میں نے کراچی کے ڈاکٹر محمد علی مسٹری کو فون کیا کہ وہ کوئی پہنچے۔ ڈاکٹروں نے ایک بار پھر اس بارے میں صلاح مشورہ کیا اور صورت حال کے منقی اور ثابت دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں فوراً کراچی لے جانا ضروری ہے کیونکہ ان کے کمزور دل کے لئے کوئی کی بلندی مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے بادل نخواستہ مجھے آگاہ کیا کہ اب امید کی کوئی کرن باقی نہیں ہے اور صرف کوئی مجزہ ہی قائدِ اعظم کی زندگی بچا سکتا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو ان کے ڈاکٹروں کے اس مشورے کے متعلق بتایا کہ کوئی کی بلدنی سے پہنچنے کے لئے انہیں کراچی لے جایا جائے تو انہوں نے کہا: ”ہاں..... مجھے کراچی لے چلئے... میں وہیں پیدا ہوا تھا..... میں وہیں..... دفن ہونا چاہتا ہوں۔“ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں انکے بستر کے پاس کھڑی رہی، ان کی بیہوٹی میں، میں انکے خیالات کی بڑی بڑی اہمیت سن سکتی تھی۔ وہ غیند میں سرگوشی کر رہے تھے: ”کشمیر..... انہیں..... فیصلہ کرنے کا..... حق دیجئے..... آئین..... میں اسے جلد ہی ..... مکمل کروں گا..... مہاجرین ..... انہیں ہر ممکن ..... امداد دیجئے..... پاکستان.....“

گورنر جزل کے طیارے وہی کگ کو فی الفور کو سلاٹنے کا حکم دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے گیارہ ستمبر کو فیصلہ کیا کہ ہمیں دو بجے دو پہر کراچی روائی کیلئے کوئیہ کے ہوائی اڈے پر پہنچ جانا چاہئے، جب قائد کو ایک سڑپچر پر لٹا کر وائی سنگ کے کیپن میں لے جایا جا رہا تھا تو پائلٹ اور طیارے کے عملے کے دوسرے ارکان انہیں سلیوٹ کرنے کیلئے قطار میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بمشکل اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ان لوگوں کے سلیوٹ کا جواب دیا۔

ہم نے انہیں ان سیٹوں پر آرام سے لٹا دیا، جنہیں ایک عارضی بستر کی شکل میں کیپن کے سامنے رکھا دیا گیا تھا، ڈاکٹر متری، سرڑ ڈنہام اور میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے خبردار کیا کہ اسے کچھ وقت کیلئے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنا پڑے گی مگر جو نہیں وہ بلوچستان کے پہاڑوں سے آگے نکل جائیگا تو طیارہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکے گا۔ آسیجن سلنڈر اور گیس ماسک تیار رکھے گئے اور زیادہ بلندی پر قائد کو آسیجن دینے کا فرض میرے ذمے تھا۔ ہم فضاء میں بلند ہو چکے تھے۔ وائی سنگ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ قائد کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ میں نے گیس ماسک ان کے منہ سے لگا دیا، وہ کچھ دیر تک آسیجن لیتے رہے اور پھر ماسک منہ پر سے ہٹا دیا جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں: ”اس کی ضرورت نہیں، سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“ میں نے ڈاکٹر متری سے ڈاکٹر الہی بخش کو بلاں کے لئے کہا اور یہ دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر الہی بخش انہیں آسیجن لینے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اس سے زیادہ تشویشناک ہوائی سفر کبھی نہیں کیا۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سہہ پھر سوا چار بجے کراچی کے مارٹی پورا پورٹ پر اترے۔ یہیں ایک برس قبل قائد ہوائی جہاز سے اترے تھے تو انہیں پر امید تھے کہ وہ پاکستان کو

ایک عظیم قوم بنادیں گے۔ تب ان کے استقبال کیلئے ہر رونگوگار ائر پورٹ پر امداد آئے تھے جن میں وزیر اور سفارت کار بھی شامل تھے مگر اس روز جیسا کہ پہلے ہی ہدایت کی جا چکی تھی، ائر پورٹ پر کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ جب ہم طیارے سے باہر نکلے تو ہمارا استقبال کرنے والا پہلا شخص گورنر جنرل کا ملٹری سیکرٹری کرنل جیفرے نولز تھا۔ قائد کو سٹریچ پر لتا کر ایک ملٹری ایمبولینس تک لے جایا گیا جو انہیں گورنر ہاؤس لے جانے کے لئے ہوا تھا اڑے پر پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ سسٹر ڈنہام اور میں قائد کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گئیں۔ ایمبولینس انہی کی آہنگی سے چل رہی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے دوسرے لوگ کاروں کے ذریعے ائر پورٹ سے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر الہی بخش، ڈاکٹر متری اور گورنر جنرل کا ملٹری سیکرٹری ایمبولینس کے پیچھے گورنر جنرل کی کیڈ لک کار میں آ رہے تھے۔

تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایمبولینس کے انہن نے پہلی لی جیسے کھانس رہا ہوا سانس لینے کی کوشش کر رہا ہوا اور اس کے بعد اچانک بند ہو گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں ایمبولینس سے باہر نکلی تو مجھے بتایا گیا کہ ایمبولینس میں پڑول ختم ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نے بے چینی کے عالم میں انہن کو دیکھنا بھانا شروع کر دیا مگر وہ شارٹ نہ ہو سکا۔ جب میں دوبارہ ایمبولینس میں داخل ہوئی تو قائد کے ہاتھ میں آہنگ سے حرکت پیدا ہوئی اور انکی آنکھوں نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے نیچے جھک کر ان سے کہا: ”ایمبولینس کا انہن خراب ہو گیا ہے۔“

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کراچی میں عموماً تیز سمندری ہوا میں چلتی رہتی ہیں، جن کے باعث درجہ حرارت کم رہتا ہے اور گرم موسم کی شدت کم ہو جاتی ہے مگر اس روز سمندری ہوا نہیں چل رہی تھیں اور

گرمی ناقابل برداشت تھی۔ اس تکیف وہ مسی و روتیل پر مترادوہ بیسیوں بھیاں تھیں جوان کے چہرے کے اردو گردمنڈ لارہی تھیں اور ان میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ ان کے حملے سے بچنے کیلئے اٹھا سکیں۔ سسڑڈ نہام اور میں دوسری ایمبویلینس کے آنے کے انتظار میں باری باری ان کے چہرے پر پنکھا جھلتی رہیں۔ ہر منٹ سوہانِ روح تھا۔ قائد ایک ایک کیڈ لک کار میں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس میں سرپرچر رکھا جا سکتا اور یوں ہم انتظار کرتے رہے اور امید پر کہ.....

اس جگہ کے آس پاس کی سینکڑوں جھلکیاں تھیں جو اس بات سے خبر اپنے کام کا ج میں مصروف تھے کہ ان کے قائد جنہوں نے انہیں ایک الگ ڈن لیکر دیا، ان کے عین درمیان ایک ایمبویلینس میں بے یار و مددگار پڑے ہیں جس کا پڑول ختم ہو چکا ہے۔ کاریں اپنے راستے پر گامزن تھیں۔ بسیں اور ٹرک چیختے دھاڑتے اپنی اپنی منزلوں کی جانب روائی دواں دواں تھے مگر ہم وہاں ایک ایسی غیر متحرک ایمبویلینس میں کھڑے تھے جو ایک اچھے آگے بڑھنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ اور اس کے اندر ایک قیمتی زندگی قطرہ قطرہ اور سانس بہ سانس اختتام کی جانب گامزن تھی۔

ہم نے وہاں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک انتظار کیا۔

میری پوری زندگی میں کوئی گھنٹہ اس ایک گھنٹے سے زیادہ دردناک نہیں گزرا۔ پھر ایک دوسری ایمبویلینس آئی۔ انہیں سرپرچر پر دوسری ایمبویلینس میں منتقل کیا گیا اور یوں ہم بالآخر گورنر جنرل ہاؤس کے لئے روانہ ہوئے۔ جب انہیں نہایت آرام سے ان کے بستر پر لٹایا گیا تو ڈاکٹر الہی بخش کی گھڑی کے مطابق ہمیں ماڑی پورا ار پورٹ پر اترے دو گھنٹے سے بھی زائد وقت گذر چکا تھا۔ دو گھنٹے کوئی سے کراچی آنے میں لگے اور دو گھنٹے ماڑی ار پورٹ سے گورنر

ڈاکٹروں نے انکا معاشرہ کیا اور کہا کہ ہوائی سفر اور ایم بولینس کے تکلیف دہ واقعہ کے باوجود ان کی صحت پر کوئی برے اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے اور ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے گورنر جزل ہاؤس سے چلے گئے کہ وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے، اب میں اپنے بھائی کے پاس تھا تھی جو گہری نیند سور ہے تھے۔ میں نے وجدانی طور پر محسوس کیا کہ ان کی گہری نیند شمع کے اس آخری شعلے کی مانند ہے جو بجھنے سے پہلے زیادہ نمایاں اور بھر پور ہوا کرتا ہے۔ خاموشی کے اس عالم میں میرا دماغ ان کے ساتھ با تین کر رہا تھا۔

”جن، کاش ایسا ہو سکے کہ میرا تمام خون نکال کر آپ کے جسم میں داخل کر دیں تاکہ آپ زندہ رہ سکیں۔ کاش خدا میری زندگی کے تمام سال مجھ سے لے لے اور انہیں آپ کو دے دے تاکہ آپ ہماری قوم کی رہنمائی کرتے رہیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو خداوند کریم میں تیری بیحد شکر گذار رہوں گی۔

وہ کسی خلل کے بغیر تقریباً دو گھنٹے تک گہری نیند سوتے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور سر اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا، انہوں نے بات کرنے کی آخری کوشش کی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے:

”فاطمی، خدا حافظ! لا الہ الا اللہ..... محمد..... الرسول..... اللہ۔“ اور ان کا سر آہنگ سے قدرے دائیں جانب کوڑا ہلک گیا۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں چیختی چلاتی کمرے سے بھاگی: ”ڈاکٹر، جلدی کچھ، میرا بھائی مر رہا ہے، ڈاکٹر کہاں ہیں؟“

ڈاکٹر چند منٹ میں پہنچ گئے اور انہوں نے قائد اعظم کا معاشرہ کرنا اور انہیں انجکشن دینا

شروع کر دیئے۔ میں وہاں خاہوش ہو رہے تھے جس درجت کھڑی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان کا پورا جسم سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں جانتی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ موت انہیں اس دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانے کیلئے آچکی تھی۔ دوسری زندگی جوابدی اور غیر فانی ہے۔

کریل اللہی بخش بوجھل قدموں کے ساتھ میری جانب بڑھے، اپنی دائیں ہتھیلی میرے بائیں کندھے پر رکھی اور چھوٹے سے پچھے کی طرح بلک بلک کرو نے لگے۔ ان آنسوؤں نے ایک ایسی زبان میں مجھ تک وہ مہلک خبر پہنچا دی جس میں نہ الفاظ ہوتے ہیں اور نہ کوئی آواز۔ میں نے اپنے آنسوؤں کو تلاش کیا مگر میرے اندر آنسوؤں کے تمام سوتے بھی شاید خشک ہو چکے تھے۔ میں چیختا، چلانا چاہتی تھی مگر میری آواز خاموشی کی اتحاد گہرا ہیوں میں ڈوب چکی تھی۔ میں خود کو گھسیتے ہوئے بمشکل تمام ان کے بستر تک پہنچی اور خود کو لکڑی کی بے جان گیلی شاخ کی طرح فرش پر گرا دیا۔

ان کے انتقال کی خبر یقیناً چار دنگ عالم میں پھیل گئی ہوگی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے بڑے بڑے آہنی پھانٹک جن پر عام حالات میں سخت حفاظتی اقدامات کے ذریعے غیر متعلقہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روک دیا جاتا تھا، آج پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور ہر سمت سے لوگوں کے نہ ختم ہونے والے ریلے گورنر جنرل ہاؤس کے اندر بہتے چلے آرہے تھے۔

ان میں سے کچھ لوگ جلد ہی قائد اعظم کے کرے میں پہنچ گئے جہاں وہ کسی خلل کے بغیر پڑے ایسی نیند سو رہے تھے جو بیداری سے بہت دور تھی۔ میں وہاں بیٹھ گئی اور اپنے ماحول سے بے خبر میں اپنے اپ کو اپنے ناقابل تلافی نقصان میں مکمل طور پر گم کر چکی تھی۔

مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں وہاں کب تک بیٹھی رہی اور اس سفید چادر کو گھورتی رہی جس کے

بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک بوڑھی خاتون جسے میں نے اس سے پہلے تو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ میں اسے جانتی تھی، اس نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر چپکے سے میرے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

اَنَّا لِلَّهِ وَ اَنَا إِلَيْهِ رَاجِعٌ۔

(ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔)

**www.freepdfpost.blogspot.com**

*Share*

